ڈاکٹر ابراہیم دیشمکھ کی آپ بیتی "جستجوئے حق" میں اسلام سے متعلق اشکالات: تجزیاتی مطالعہ

شگفتہ نوید*

حافظ محمد نوید**

Abstract

Religious tolerance has been of great significance in the primitive Indian sub-continent. The Muslim Rulers of the sub-continent laid down the foundation of the great humanitarian values of mutual religious tolerance among the followers of different religions. They not only respected the religious feelings, practices and values of the other religious followers but also ensured the protection and continuity of their religious rites, places and customs. There was complete religious harmony among different religions and their followers but a shameful period of the decline of the values of religious forbearance started with the arrival of the British in the sub-continent. The British Colonial Rulers gave air to the Muslim-Christian religious conflict to strengthen their political rule in India. They printed, published, promoted and propagated controversial religious literature against Islam and the Muslims with the help of Christian priests. The autobiographies of the newly converted Christians are an important part of this religious literature which is comprised of priceless information related to religious beliefs, rites, practices, morals, economy, society, politics and other walks of life. The religious studies and analysis can be made impartial and unprejudiced with the help of this valuable treasure house of religious literature. This is the worthy information which can be extremely beneficial to assess the positives and negatives of different religions. Dr. Ibrahim Daishmukh's autobiography "Justajoo-e-Haq" has a unique significance in this regard. This research article is presented to have an impartial study of the information compiled in this book.

Keywords: Autobiography, Christianity, Dr. Ibrahim Daishmukh, Islam, Justajoo-e-Haq, Religious Tolerance, Sub-continent, The British.

*پی ایچ ڈی سکالر، شعبہ علومِ اسلامیہ، گفٹ یونیورسٹی، گوجرانوالہ۔

**پی ایچ ڈی سکالر، شعبہ علومِ اسلامیہ، گجرات یونیورسٹی، گجرات۔

موضوعِ تحقیق کا تعارف، اہمیت اور پسِ منظر:

مذہبی برداشت اور سماجی ہم آہنگی برصغیر کی قدیم تاریخ سے جُڑی وہ قابلِ فخر حقیقتیں ہیں جن کا اعتراف مختلف مذاہب سے وابستہ مؤرخین و محققین بجاطور پر اپنے اپنے اسالیب ورُجحانات کے مطابق کرتے آئے ہیں اور اقوامِ عالم میں اس خطے کی یہ انفرادیت ہمیشہ دلکشی اور اہمیت کا باعث رہی ہے۔ یہاں مسلمانوں کی آمد ایک ایسا خوبصورت اور پُرسعادت تہذیبی تجربہ ہے جس کے نتیجے میں انسان دوستی، مختلف مذاہب کے حاملین کی خدمات کے اعتراف اور مذہبی رواداری کو فروغ حاصل ہُوا۔ سلاطینِ دہلی اور مغل حکمرانوں نے مختلف مذاہب سے وابستہ لوگوں کے مذہبی جذبات کے احترام کے ضمن میں شاندار اور مستحکم روایات کو اپنایا۔ مذہبی اشتعال اور توہین و تشدد کے عناصر اس وقت سامنے آئے جب یورپی اقوام نے تجارت کے بہانے برصغیر کا رُخ کیا خصوصاً انگریز کی آمد سے یہاں سیاسی وسماجی اور مذہبی شعبہ جات میں ایک شر م ناک دورِ زوال کا آغاز ہوا۔ انگریز نے اپنے سیاسی اقتدار کے استحکام کے لیے مسلم۔ مسیحی کشمکش کو جاری کیا۔ انہوں نے مسیحی پادریوں کی مدد سے اسلام اور مسلمانوں کے خلاف اشتعال انگیز مذہبی لٹریچر تیار کرایا۔ اسلام چھوڑ کر مسیحیت کو قبول کر لینے والوں کی آپ بیتیاں اس متنازع مذہبی ادب کا ایک اہم حصہ ہیں۔ برصغیر کے مذہبی و تاریخی پسِ منظر خصوصاً نوآبادیاتی دور کی مذہبی حسّاسیّت کی تفہیم کے لئے نو مسیحیوں کی ان آپ بیتیوں کا مطالعہ نہایت مفید ہے۔ ہمہ جہتی اہمیت کے حامل اس مذہبی ادب میں عقائد، عبادات، رُسوم، اخلاقیات، معاملات، معیشت، معاشرت اور سیاست سمیت انسانی زندگی کے مختلف پہلوؤں سے متعلق بیش قیمت اور تاریخی اہمیت کی حامل معلومات ملتی ہیں۔ اس قابلِ قدر علمی مواد کی مدد سے مذہبی مطالعات و تجزیات کو غیر متعصّبانہ اور غیر جانب دارانہ بنایا جاسکتا ہے۔ یہ وہ حسّاس ریکارڈ ہے جس سے عمل کے میدان میں مختلف مذاہب کے حاملین کی خوبیوں اور خامیوں کا اندازہ کیا جاسکتا ہے، اسی مخصوص علمی پسِ منظر میں ڈاکٹر ابراہیم دیشمکھ (متوفی بعد از ۱۹۸۲ء)[1] کی آپ بیتی "جستجوئے حق" منفرد نوعیت کی حامل ہے۔ اس کے بہت سے مندرجات واشکالات سے تاریخی و مذہبی میادین میں اختلاف کیا جاسکتا ہے لیکن اس حقیقت سے انکار مناسب نہیں کہ برصغیر میں مسلم۔ مسیحی کشمکش کے بہت سے پہلوؤں کے بارے میں بنیادی معلومات کا یہ ایک اہم اور قدیم ماخذ ہے۔ اس متنازع اور اشتعال انگیز مذہبی ادب کے سنجیدہ مطالعہ و تجزیہ کے نتیجے میں اُن مذہبی، سیاسی، سماجی، معاشی اور نفسیاتی اسباب کی کھوج

---

[1] ڈاکٹر ابراہیم دیشمکھ کے احوال وآثار میں بہت سے ابہامات موجود ہیں، دسمبر ۱۹۷۹ء میں ان کو غدود کا کینسر ہوا، وہ ۱۹۸۲ء میں صحت یاب ہو گئے، کوئی ایسا تاریخی ودستاویزی ریکارڈ دستیاب نہیں جس سے یہ اندازہ کیا جاسکے کہ ان کی وفات کب ہوئی، (دیشمکھ، ابراہیم خان عمر خان، ڈاکٹر، جستجوئے حق، ص:۱-۵۰ www.muhammadanism.org,Date:09-07-2017,Time:09:10PM)

باآسانی لگائی جاسکتی ہے جن کی وجہ سے برصغیر کے انگریز عہد حکومت میں بعض کمزور ایمان مسلمان ترکِ اسلام کر کے حلقۂ مسیحیت میں داخل ہو گئے۔ڈاکٹر ابراہیم دیشمکھ نے اپنے قبولِ مسیحیت کے تیس سال بعد اپنی آپ بیتی کو تحریر کیا۔ اس کی ترتیب وتدوین میں ارنسٹ ہان نے اہم کردار ادا کیا۔[2] اس منفرد تحریر میں مصنف کے حالاتِ زندگی، مذہبی پسِ منظر اور ترکِ اسلام کی وجوہات کا تذکرہ ہے۔اس میں اُن ابہامات کو درج کیا گیا ہے جو مصنف کو مسلمان ہونے کی حیثیت سے درپیش تھے۔مذکورہ آپ بیتی کے مباحث اوراسلام سے متعلق ان میں درج مختلف الجہات اشکالات واعتراضات کا تجزیہ علمی وفکری حلقوں کی ایک اہم ضرورت ہے۔علم وعقیدہ اور تاریخ وتشخص سے وابستہ اسی تہذیبی ونظریاتی ضرورت کی تکمیل کے لئے زیرِ نظر تحقیقی مضمون تشکیل دیا گیاہے۔مضمون ہذا چار اجزا پر مشتمل ہے،پہلے جُزو میں موضوع تحقیق کے تعارف، اہمیت اور پسِ منظر کی وضاحت کی گئی ہے،دوسرے جُزو میں ڈاکٹر ابراہیم دیشمکھ کے قبولِ مسیحیت کے پسِ منظر کو بیان کیا گیا ہے، تیسرے جُزو میں اس کی آپ بیتی "جستجوئے حق " کے مباحث کا تذکرہ کرتے ہوئے اسلام سے متعلق اشکالات کا تجزیہ کیا گیاہے اور چوتھا جُزو خلاصہ بحث سے متعلق ہے۔

ڈاکٹر ابراہیم دیشمکھ کے قبولِ مسیحیت کا پسِ منظر:

آپ کا پورا نام ڈاکٹر ابراہیم خان عمر خان دیشمکھ ہے، آپ کا تعلق مغربی ہندوستان کے ایک غیر معروف گاؤں "توڈیل" سے تھا، درمیانے درجے کے مسلم خاندان میں پیدا ہوئے،والد کاشتکاری کرتے تھے،خاندان کے لوگوں کو مذہب سے کوئی خاص دلچسپی نہ تھی، مذہبی تعلیم کے انتظامات بھی خاطر خواہ نہ تھے،اس سے اُس کے ہاں مذہب بیزاری کا رویہ پیدا ہوا، وہ ایک ذہین طالب علم تھا، میڈیکل کالج میں حُصولِ تعلیم کے دوران مسیحیوں سے تعلقات قائم ہوئے، مسیحی دوستوں کے طرزِ عمل نے مثبت طور پر متاثر کیا تو مطالعۂ انجیل کی ترغیب ہوئی، قرآن وانجیل کے تقابلی مطالعات کئے، قرآن سے متعلق مختلف اشکالات کا شکار ہو گئے، قصصِ قرآنی پر اعتراض کرنے لگے، تحریفِ بائبل سے متعلق مسلمانوں کے موقف سے مطمئن نہ تھے، بائبل وقرآن کے باہمی اختلافات سے پریشان ہوئے،اُن کو تعجب تھا کہ قرآن مجید نے بائبل میں درج معلومات اور انبیاءواُمم کے قصص کو بیان کیوں نہیں کیا،ان کو قرآن مجید کے تاریخی پسِ منظر ،جمع وتدوین اور انداز واُسلوب پر اشکالات محسوس ہوئے، قرآن کے تصورِ ناسخ ومنسوخ کی حقیقت کو وہ سمجھ نہ سکے، جہاد پر ابہامات کا شکار ہو گئے، توسیعِ اسلام کے مختلف ذرائع پر وہ اعتراضات کرنے لگے، قرآن مجید کے لوحِ محفوظ پر لکھے جانے سے بھی وہ

[2] ارنسٹ ہان، دیباچہ، مشمولہ **جستجوئے حق**، از ڈاکٹر ابراہیم خان عمر خان، دیشمکھ

مطمئن نہ تھے، وہ بائبل میں موجود مفید ومناسب باتوں سے استفادہ کرنے پر اصرار کرنے لگے، انہوں نے حدیث کے حوالے سے بھی مطالعات کئے، حجیتِ حدیث پر بھی اطمینان کی کیفیت حاصل نہ ہو سکی، گناہ اور نجات سے متعلق اسلامی تعلیمات پر وہ اعتراضات کرنے لگے، مختلف اقسام کے اوہام اور اشکالات کے نتیجے میں اسلام کو خیر باد کہہ دیا اور مسیحیت قُبول کرلی، مسیحیت کے لئے غیر معمولی خدمات انجام دینے کے لئے پُر عزم رہے۔ تبلیغِ مسیحیت اور مسیحی عوام کی خدمت کو اپنا شعار بنایا، قُبولِ مسیحیت پر خاندان کی طرف سے شدید ردِّ عمل آیا مگر جلد خاندان سے سماجی روابط بحال ہو گئے۔[3] اُس نے ظاہر کیا کہ وہ قُبولِ مسیحیت سے مطمئن ہے مگر اس اطمینان کے حقیقی اسباب تلاش کرنے کی تاحال ضرورت ہے۔

ڈاکٹر ابراہیم دیشمکھ کے حالات کے بارے میں بہت کم معلومات حاصل ہو سکی ہیں، اُن کے بارے میں معلومات کا بڑا ذریعہ زیرِ نظر آپ بیتی ہی ہے، یقیناً اُن کے حالات کی تصدیق اور اُن کے فکر وخیال کا غیر جانب دارانہ تجزیہ مزید تاریخی حقائق کی دریافت کا متقاضی ہے۔ اُن کا خاندانی پسِ منظر، سماجی ومذہبی حالات، اسلام کے بارے میں تشکیک اور قُبولِ مسیحیت کے حقیقی محرکات ایسے موضوعات ہیں جن کی تحقیق وتفتیش نہایت ضروری ہے۔ مصادرِ تاریخ کی بہت کم دستیابی کے نتیجے میں محض آپ بیتی میں درج بیانات کا تجزیہ کیا جاسکتا ہے۔ مصنف نے مسلم علماء سے رہنمائی نہیں حاصل کی، وقت کے مسلم مناظرین سے بھی کوئی رابطہ نہیں کیا، اگر رابطہ کیا بھی ہو گا تو اُس کا تذکرہ اُس نے اپنی آپ بیتی میں نہیں کیا۔ اُس پسِ منظر میں اُس کے بیانات کی صحت مشکوک ہو جاتی ہے۔ اُس نے مسلمانوں کے عقائد، تاریخ اور طرزِ عمل کے بارے میں جن اشکالات کا اظہار کیا ہے اُن کا تقاضا تھا کہ وہ فکرِ اسلامی کا عمیق مطالعہ کرتا اور معاصر مسلم علماء سے براہِ راست مشاورت کرتا اور رہنمائی کا طالب ہوتا مگر آپ بیتی اس ضمن میں کوئی اشارہ فراہم نہیں کرتی، لہٰذا آپ بیتی کے دعوؤں پر یقین واعتماد کرنا تحقیق اور مطالعۂ تاریخ ومذہب کے غیر جانب دار اُصولوں کی خلاف ورزی کرنا ہے۔ مذہب ایسے حسّاس معاملہ میں مسلم علماء سے عدمِ رہنمائی بہت سے سوالات کو جنم دیتی ہے۔

"جستجوئے حق" کے اہم مباحث اور اُن میں مذکور اسلام سے متعلق اشکالات کا تجزیہ:

مصنف نے اپنے خاندانی پسِ منظر، دینی رُجحانات، اسلام سے متعلق تشکیک اور قُبولِ مسیحیت کے مختلف مراحل کو ایک خاص ترتیب سے واضح کیا ہے۔ اس کے اہم مباحث اور اسلام سے متعلق مختلف اشکالات کا تجزیہ ذیل کی سطور میں پیش کیا جاتا ہے:

---

[3] دیشمکھ، ابراہیم خان عمر خان، ڈاکٹر، **جستجوئے حق**، ۱۔۵۰

قرآنِ مجید میں حضرت عیسیٰؑ کے تذکرہ اور مسلمانوں کے مطالعہ انجیل سے متعلق اعتراضات:

کینیڈا کے پادری ارنسٹ ہان نے ۱۹۸۷ء میں اس کتاب کا دیباچہ تحریر کیا، وہ لکھتا ہے کہ جب اُس نے ڈاکٹر ابراہیم خان عمر خان دیشمکھ کی آپ بیتی کے پہلے مسودے کا مطالعہ کیا تو اُسے یقین ہو گیا کہ اُس کی کہانی بڑی دلکش ہے کیونکہ اس سے ترکِ اسلام کرنے والوں کی مشکلات کا اندازہ ہوتا ہے۔ پادری ارنسٹ ہان نے ڈاکٹر ابراہیم دیشمکھ کے فراہم کردہ طویل مواد کی تلخیص کی اور بعض مقامات پر اصلاح بھی کی۔ دیباچہ تحریر کرتے ہوئے ارنسٹ ہان نے اسلام اور مسلمانوں پر درج ذیل تحفظات واعتراضات کا اظہار کیا۔

۱۔ حضرت عیسیٰؑ کا تذکرہ قرآن مجید کی نسبت بائبل میں زیادہ واضح وجامع ہے۔ حضرت عیسیٰؑ سے متعلق قرآنی معلومات تشریح طلب ہیں، اس کی ایک اہم وجہ یہ ہے کہ قرآن کی زبان عربی ہے جبکہ حضرت عیسیٰؑ کی زبان عربی نہیں تھی۔

۲۔ مسلمان بائبل کو تحریف شدہ خیال کرتے ہیں اس لئے اس کے مطالعہ کو درست نہیں سمجھتے۔[4]

ارنسٹ ہان قرآنِ مجید کی عظمت وصداقت، جمع وتدوین اور ترتیب کی نوعیت سے واقف نہیں۔ قرآنِ مجید کے بارے میں ایک بڑی حقیقت یہ ہے کہ یہ نبی آخر الزمان حضرت محمد مصطفیٰ ﷺ پر اللہ تعالیٰ کی طرف سے نازل ہونے والی آخری کتاب ہے۔ اس میں سابقہ انبیاءؑ اور امم کا تذکرہ نصیحت وہدایت کی غرض سے ضرور کیا گیا ہے لیکن بنیادی طور پر یہ شریعتِ محمدی ﷺ کا متن ہے۔ اس پسِ منظر میں اس اعتراض کی کوئی حقیقت باقی نہیں رہتی کہ حضرت عیسیٰؑ کا تذکرہ قرآنِ مجید کی نسبت انجیل میں زیادہ ملتا ہے۔ دوسرا اعتراض حضرت عیسیٰؑ اور قرآنِ مجید کی زبان سے متعلق عدمِ مطابقت کا ہے۔ بلاشبہ قرآنِ مجید کی زبان عربی ہے اور حضرت عیسیٰؑ غیر عربی زبان بولتے تھے، اس ضمن میں اس تاریخی حقیقت کو زیرِ نظر رکھنے کی ضرورت ہے کہ قرآنِ مجید میں درجنوں انبیاءؑ کا تذکرہ ہے جبکہ ان تمام انبیاءؑ کی زبان بھی عربی نہیں تھی۔ اس بات کو سمجھنے کی ضرورت ہے کہ اللہ تعالیٰ اپنے بندوں تک پیغام پہنچانے کے لئے کسی خاص زبان کا پابند اور محتاج نہیں ہے، اللہ تعالیٰ جس نبی یا قوم کا تذکرہ چاہے قرآن میں بیان کر سکتا تھا۔[5] تیسرا اعتراض یہ ہے کہ چونکہ مسلمان بائبل کو تحریف شدہ خیال کرتے ہیں اس لئے وہ اس کے مطالعہ میں ہچکچاہٹ محسوس کرتے ہیں۔ اس اعتراض کے جواب میں اتنا سمجھ لینا ضروری ہے کے مسلمانوں کے ہاں انجیل کے مطالعہ کی روایت بڑی مستحکم ہے۔ مسلم علماء میں امام ابو محمد

---

[4] ارنسٹ ہان، دیباچہ، مشمولہ **جستجوئے حق** از ڈاکٹر ابراہیم خان عمر خان، دیشمکھ

[5] صبحی الصالح، **مباحث فی علوم القرآن**، (بیروت: دار العلم للملایین، ۲۰۰۰ء)، ا۔۲۵

الرسی (م۲۴۶ھ)،علامہ ابن ربن طبری(م۲۴۷ھ)، ابن اسحٰق الکندی (م۲۵۲ھ)،امام جاحظ(م۲۵۵ھ)،الناشی الاکبر(م۲۹۳ھ)، الوراق(م۲۹۷ھ)،امام ابو منصور الماتریدی (م۳۳۳ھ)، البیرونی(م۴۴۰) ،امام ابوالحسن الماوردی(م۴۵۰ھ)،ابوالولید الباجی الاندلسی(م۴۷۴ھ)،ابن تیمیہ(م۷۲۸ھ)،ڈاکٹر محمد وزیر خان(م۱۸۷۳ء)،مولانا رحمت اللہ کیرانوی(م۱۸۹۱ء)،سید ابوالمنصور ناصر الدین دہلوی(م۱۹۰۳ء)،سید محمد علی مونگیری(م۱۹۲۷ء)، قاضی محمد سلیمان منصور پوری(م۱۹۳۰ء)،مولانا ثناء اللہ امر تسری (م۱۹۴۸ء)اور مولانا محمد ابراہیم میر سیالکوٹی(م۱۹۵۶ء)وہ نامور شخصیات ہیں جنہوں نے مسیحیت اور اس کے مختلف مصادر کے مطالعہ کے ضمن میں بڑی شہرت پائی ہے۔[6]

قصصِ قرآن پر اعتراض:

مسیحی حلقوں میں نشست وبرخاست کی وجہ سے ڈاکٹر ابراہیم دیشمکھ کو بہت سے سوالات پریشان کرنے لگ گئے تھے۔اُس نے لکھا:

"کالج کے ان ہی ایام میں مقدس بائبل پر مبنی دو فلمیں بمبئی میں نمائش کے لئے پیش کی گئیں: کوواڈس اور دی ٹین کمانڈمینٹس ۔لاتعداد مسلمانوں نے ان فلموں کو دیکھا جن میں کئی برقعہ پوش خواتین بھی شامل تھیں۔مجھے تعجب اس بات پر ہوا کہ حضرت موسیٰ کا قصہ قرآن مجید سے بھی زیادہ تفصیل سے مقدس بائبل میں بیان کیا گیا ہے حالانکہ بعد میں مجھے پتہ چلا کہ اس فلم میں بائبل کے قصہ کے علاوہ چند اور باتیں بھی شامل کی گئی تھیں۔کیا قرآن مجید میں ہر وہ قصہ درج نہیں ہے جو پہلی آسمانی کتابوں میں پایا جاتا ہے؟حالانکہ میں اپنے مذہب کو بہتر اور افضل مانتا رہا۔لیکن ان باتوں سے میں کچھ پریشان ضرور ہوا۔"[7]

مطالعۂ بائبل کے دوران اُسے درج ذیل معاملات میں بائبل اور قرآنِ مجید کے موٴقف میں اختلاف نظر آیا۔

اَ. بائبل و قرآن، دونوں کلامِ خدا ہیں تو ان کے بیانات باہم مختلف کیوں ہیں؟

ب. قرآن میں موجود و مذکور قصصِ انبیاء کو سابقہ آسمانی کتب میں درج کیوں نہ کیا گیا؟

ت. قرآن نے قصۂ آدمؑ کے ضمن میں بیان کیا کہ خدا کے حکم سے فرشتے حضرت آدمؑ کے آگے سربسجود ہو گئے لیکن ابلیس نے انکار کیا،اگر یہ واقعہ درست ہے تو بائبل میں اسے درج کیوں نہ کیا گیا؟

---

[6] شگفتہ نوید،ترک اسلام کے اسباب ومحرکات: برصغیر کے نو مسیحی مصنفین کی آپ بیتیوں اور سوانح عمریوں کا تجزیاتی مطالعہ،مقالہ پی ایچ ڈی(گجرانوالہ: شعبہ فکر و ثقافتِ اسلامی گفٹ یونیورسٹی، سیشن ۲۰۱۶ء،۲۰۱۹ء)،۱۶۔۲۰

[7] م،ن،۱۲

ث. بائبل میں حضرت ابراہیمؑ کا قصہ بڑا طویل ہے، مگر قرآنی موقف کے برعکس ان کے قیام مکہ کا تذکرہ بائبل نے نہیں کیا، کعبہ کی مرمت کو بھی بیان نہیں کیا گیا۔

ج. بائبل میں اُن عورتوں کا ذکر نہیں کیا گیا جنہوں نے حضرت یوسفؑ کو دیکھ کر ہاتھ کاٹ لئے تھے۔

ح. حضرت سلیمانؑ کا چیونٹیوں اور پرندہ ہدہد کی بولیاں سمجھنے کا ذکر بائبل نے نہیں کیا۔

خ. بائبل میں خدا کے اُس قہر کا تذکرہ نہیں جس کے نتیجے میں اَن گنت انسانوں کو بندر اور سور بنادیا گیا۔

د. طوفانِ نوح کے بارے میں اختلاف ہے۔ بائبل کے مطابق حضرت نوحؑ کا سارا خاندان بچ گیا جبکہ قرآن کے مطابق ان کا ایک بیٹا اس طوفان کی نذر ہو گیا۔

ذ. بائبل میں لکھا ہے کہ حضرت ہارونؑ نے بچھڑے کا مجسمہ بنانے کا حکم دیا جبکہ قرآنی تفاسیر میں اس شخص کا نام "سامری" بتایا گیا ہے۔

ر. قرآن کے مطابق حضرت مسیحؑ نے بچپن میں معجزات دکھائے جبکہ بائبل کے مطابق پہلا معجزہ گلیل کے شہر قانا میں پیش آیا، اُس وقت آپ کی عمر مبارک تیس سال تھی۔

ز. قرآن میں لکھا ہے کہ حضرت مسیحؑ کو صلیب پر چڑھانے کا ارادہ تو کیا گیا مگر ایسا ہو نہ سکا، اس کے برعکس بائبل نے صلیب پر آپ کو موت، تجہیز و تکفین اور دوبارہ جی اُٹھنے کو بیان کیا ہے۔

س. بائبل حضرت مسیحؑ کو خدا کا بیٹا کہتی ہے جبکہ قرآن نے اس تصور کی تردید کی ہے۔

ش. بائبل تین خداؤں کا ذکر کرتی ہے جبکہ قرآن توحید کا درس دیتا ہے۔[8]

قصصِ انبیاء اور معجزات کے تذکروں میں اختلافات سے مصنف نے یہ نتیجہ اخذ کیا کہ قرآن مجید کا کلام خدا ہونا مشکوک ہے۔ مصنف اس ابہام کا شکار ہوا کہ مسلمانوں کے دعوؤں کے مطابق قرآن مجید میں پہلی آسمانی کتب کے وہ سبھی بیانات شامل کئے گئے ہیں جنہیں جاننا ضروری ہے مگر امر واقعہ یہ ہے کہ قرآن نے بہت ایسے انبیاء کے واقعات درج نہیں کئے جن کو بائبل نے بڑی تفصیل سے ذکر کیا ہے۔ وہ لکھتا ہے:

"کیا مقدس بائبل میں پیش کئے ہوئے حضرت یسعیاہ، حضرت یرمیاہ، حضرت حزقی ایل، حضرت ہوسیع، حضرت عاموس، حضرت میکاہ اور دوسرے کئی نبیوں کے قصص جن کے ناموں کا نشان تک قرآن مجید میں نہیں

[8] دیشمکھ، ابراہیم خان عمر خان، ڈاکٹر، **جستجوئے حق**، ص: ۲۰،۱۹،۱۸

ملتا، در گزر کئے جائیں گویا ان کی آج ضرورت ہی نہ رہی؟ اگر ان نبیوں کو بھلا دیا گیا تو پھر ان کا احترام کیسے کیا جائے گا؟ کیا ان قصوں میں آج ہمیں کوئی دینی، تاریخی یا سیاسی سبق نہیں ملتا؟ اگر مختصر معلومات ہی کافی ہے تو پھر قرآن مجید میں اکثر بیانات اور واقعات کو بار بار دہرایا کیوں گیا ہے؟"[9]

حضرت مسیحؑ کے بارے میں قصص قرآنی پر اعتراض کرتے ہوئے مصنف نے لکھا:

"مسیح کو اپنی سوانح حیات اور آپ کی تعلیم اس تفصیل سے قرآن مجید میں کہاں بیان کی گئی ہے جیسی کہ مقدس بائبل میں پائی جاتی ہے، خصوصاً خدا اور ہمارے پڑوسی سے متعلق آپ کے طویل اور فصیح مقالے، خدا کی بادشاہت سے متعلق آپ کی تمثیلیں، آپ کے متعدد معجزات کے تذکرے، حواریوں کے ساتھ آپ کی انتہائی محبت کے چرچے اور مباحثے وغیرہ؟ نیک سامری اور فضول خرچ بیٹے کی تمثیلیں یا ان جیسی کوئی تمثیل قرآن مجید میں ڈھونڈیں تو کبھی نہیں ملتی۔ کیا انہیں اور ان کے ساتھ خاکساری اور محبت کا مطلب سمجھانے والے وہ معنی خیز اور روشن خیال مباحثے بھی بنا سنے ترک کر دئے جائیں، خصوصاً اس محبت کے متعلق مباحثے جو ان متعقدوں کے لئے وقف کی گئی ہے جو سچے دل سے خدا کی محبت اور راستبازی کی طرف رجوع کر لیتے ہیں؟"[10]

وہ خدا کی محبت کے پسِ منظر میں قصص قرآنی پر اعتراض کرتے ہوئے لکھتا ہے:

"کیا محبت کی یہ غزل منسوخ ہو چکی ہے؟ اصل انجیل کی ان سے بھی اعلیٰ آیات آسمان پر اُٹھالی گئی ہیں؟ کیا تمام مسیحی اس قدر ریاکار تھے کہ بذات خود مسیح کی انجیل میں اس قدر بڑے پیانہ پر تبدیلی (تحریف) کرنے کے باوجود مسیح کی معرفت خدا کی محبت جتانے والے اس غزل کو نہایت گرمجوشی سے گاتے ہیں جس کی بدولت اب ان کے دل مسیح کی روح سے معمور ہو گئے ہیں۔ کیا قرآن مجید میں ایسی محبت کی کوئی مثال ملتی ہے؟ کہاں ہیں اس کتاب میں مقدس بائبل جیسے معجزات اور نشانیاں یا اس جیسے بیانات یا وہ طرز تحریر اور حسن بیان جن میں انہیں مقدس بائبل میں پیش کیا گیا ہے؟"[11]

ان بیانات کے تناظر میں مصنف نے تحریفِ بائبل سے متعلق مسلمانوں کے موقف پر تنقید بھی کی ہے۔ وہ قرآن کے مقابلے میں بائبل کو فوقیت دیتا ہے، اُس کا موقف ہے کہ بائبل معجزات کے بیان میں زیادہ مفصل و معتبر کتاب ہے۔ ان اعتراضات کو رفع کرنے کے لیے ضروری ہے کہ قرآنِ مجید کے فلسفۂ قصص کو سنجیدگی سے سمجھا جائے۔ بلاشبہ

[9] م،ن، ۲۰

[10] م،ن، ۲۰،۲۱

[11] م،ن، ۲۲

واقعات کے بیان سے وعظ و نصیحت کا سامان کرنا انسانی طبیعت کے عین مطابق ہے۔ دینی ادب میں دعوتی و تفہیمی مقاصد کے لئے واقعات و قصص کا استعمال نہ صرف یہ کہ انسانوں کے نفسیاتی تقاضوں سے مکمل طور پر ہم آہنگ ہے بلکہ تاریخی حقائق کی دریافت اور زمانی ترتیب کی تشکیل کے ضمن میں بھی یہ مفید و مؤثر اُسلوب ہے۔ اس آسان فہم اور نتیجہ خیز انداز واُسلوب کی کار فرمائی الہامی مذاہب کے ساتھ ساتھ غیر الہامی مذاہب کی بنیادی کُتب میں بھی دکھائی دیتی ہے۔ بیانِ قصص کی یہ مقبولِ عام روایت کسی خاص مذہب تک محدود نہیں۔ یہی وجہ ہے کہ قرآن مجید نے اپنے آفاقی پیغام کی وضاحت وترسیل کے لیے واقعات کو بیان کرنے کا اُسلوب بھی اپنایا۔ واقعات و قصص کا بیان کہیں اجمال واختصار سے ہے اور کہیں تفصیل و طوالت سے۔ قرآن فہمی اور معرفتِ حقائق کے ضمن میں ان قصص کو بڑی اہمیت حاصل ہے۔ قصصِ قرآنی کی اس افادیّت واثر پذیری کو تسلیم کرنے کے برعکس مسیحی پادریوں نے اس ضمن میں بے جا اعتراضات کئے ہیں۔ جن خواتین وحضرات نے اسلام چھوڑ کر مسیحیت کو قبول کیا اُن کے مذہبی مطالعات غیر معمولی طور پر کمزور تھے۔ اس ضمن میں ڈاکٹر ابراہیم دیشکھ کا تذکرہ موقع و محل کے مطابق ہے۔ وہ ایک مسلمان گھرانے میں ضرور پیدا ہوئے تھے مگر مذہبی معاملات سے عدمِ دلچسپی اُن کو خاندانی وراثت کے طور پر ملی تھی۔ اُن کے گاؤں میں مذہبی تعلیم کے سلسلہ میں کئے گئے انتظامات نہ ہونے کے برابر تھے۔ یہی وجہ ہے کہ وہ اعلیٰ تعلیم کے حُصول تک مذہب بیزاری کے رویے کا حامل رہا۔ مسیحی دوستوں کی قُربت نے مطالعۂ بائبل کی جانب راغب کیا۔ قرآن پڑھنا شروع کیا تو بائبل کے واقعات کسی دوسرے پسِ منظر میں پڑھنے کو ملے۔ تشکیک کا شکار ہوگئے، قصص قرآنی سے مطمئن نہ ہوسکے، واقعات کے اختلاف سے ابہام پیدا ہُوا، وہ پریشان تھے کہ بائبل اور قرآن کی تاریخی معلومات خصوصاً مختلف اُمتوں اور اُن کے نبیوں کے قصے باہم مختلف کیوں ہیں۔ [12] نتیجہ یہ ہُوا کہ وہ مسیحی ہوگئے۔ اپنی قُبولِ مسیحیت کی رُوداد "جستجوئے حق" میں انہوں نے لکھا کہ اگر قرآن اور بائبل کو کلامِ خُدا قرار دیا جاتا ہے تو اُن کے تاریخ سے متعلق بیانات میں اختلاف کیوں ہے۔ قرآنی قصص اگر سچے ہیں تو سابقہ کُتبِ سماویہ میں اُن کو درج کیوں نہ کیا گیا۔ وہ حیران تھا کہ آدمؑ، ابراہیمؑ، یوسفؑ، سلیمانؑ، نوحؑ، ہارونؑ اور مسیحؑ ایسے عظیم انبیاء کے واقعات بائبل و قرآن میں مختلف انداز واُسلوب کے حامل کیوں ہیں۔ [13] قرآنی قصص سے متعلق ان ابہامات کو رفع کرنے کے لیے قرآنی قصص کے اسالیب، مقاصد، حکمتوں اور خصائص کا جائزہ لیا جانا بہت ضروری ہے۔ قرآنِ مجید میں قصص کی اہمیت اس امر سے واضح ہوتی ہے کہ بعض سورتوں کے نام بھی انبیاءؑ کے ناموں کی نسبت سے

---

[12] م،ن، ۱۲

[13] م،ن، ۱۸۔۲۰

رکھے گئے ہیں۔ یونسؑ، یوسفؑ، ہودؑ، ابراہیمؑ، محمد صَلَّى اللهُ عَلَيْهِ وَسَلَّم اور نوح کے نام سے سورتیں اس ضمن میں قابلِ ذکر ہیں۔ نبی آخر الزمان حضرت محمد صَلَّى اللهُ عَلَيْهِ وَسَلَّم کے تذکرۂ ممتاز کے علاوہ پچیس (۲۵) انبیائے سابقہ کے قصص بیان کئے گئے ہیں۔ انبیاءؑ کے علاوہ بعض اقوام وافراد کے قصص بھی قرآن نے ذکر کئے ہیں۔ قرآنِ مجید کا اعجاز ہے کہ یہ قصص عمومی نوعیت کے تاریخی واقعات کے برعکس علم وحکمت اور عبرت ونصیحت کا بیش قیمت خزانہ ہیں۔ ان کے انتخاب وبیان میں مقصدیّت ومعروضیّت کا پہلو نمایاں ہے، قرآن نے یہ دعویٰ نہیں کیا کہ اس میں تمام انبیاءؑ واقوام کے واقعات ذکر کر دیئے گئے ہیں بلکہ محض اُن واقعات کو لیا گیا ہے جن کا تعلق اہلِ عرب سے تھا یا عربوں میں اُن کی حیثیّت تسلیم شدہ تھی۔ بیانِ واقعات میں موقع ومحل اور صحت وصداقت کے اُصولوں کا پورا التزام نظر آتا ہے۔ بعض واقعات میں تکرار ہے، اس تکرار کی حکمتوں کو سید سلیمان ندویؒ اس طرح واضح کرتے ہیں:

"ایک بڑی وجہ ان قصوں کے تکرار کی یہ ہے کہ جس طرح ایک دلیل مختلف دعووں پر اثر کرتی ہے، ایک واقعہ سے مختلف نتائج مستنبط ہوتے ہیں اور متعدد موقعوں پر ان سے استشہاد پیش کیا جاتا ہے، اس لئے ہر جگہ ان قصوں کے اعادہ سے مختلف نتائج پیدا ہوتے ہیں۔ مثلاً حضرت موسیٰؑ کا قصہ قرآن میں بار بار آیا ہے مگر غور کرو، ہر جگہ ایک جدید نتیجہ کی طرف اس سے اشارہ کیا گیا ہے، کہیں تو اظہار قدرت کے موقع پر حضرت موسیٰؑ کا قصہ بیان کیا گیا ہے، کہیں بنی اسرائیل پر خدا نے اپنے احسانات کے اظہار کے موقع پر اس قصہ کا ذکر کیا ہے، کہیں نافرمان قوموں کی ہلاکت پر اس قصہ سے استشہاد کیا گیا ہے کہیں اس سے بنی اسرائیل کی شرارت اور کفرانِ نعمت ثابت کیا گیا ہے، کہیں اس پر اظہار احسان کیا ہے، کہیں اس سے فرعون کے کفر وغرور اور نخوت کا تذکرہ مقصود ہے، کہیں اس سے انسان کی فطری کمزوری کا اظہار کیا گیا ہے۔ حضرت آدمؑ کے قصے سے خدا کے احسانات، انسان کی کمزوری، نفس امارہ کی شرارت، نوعِ انسانی کی عظمت، غرور کی مذمت، مختلف باتوں پر استدلال ہو سکتا ہے۔"[14]

قصصِ قرآنی کی صداقت وواقعیّت کے بارے میں ارشادِ ربانی ہے:

وَبِالْحَقِّ أَنْزَلْنَاهُ وَبِالْحَقِّ نَزَلَ وَمَا أَرْسَلْنَاكَ إِلَّا مُبَشِّرًا وَنَذِيرًا[15]

"ہم نے اِس کو حق کے ساتھ نازل کیا اور وہ حق وسچ ہی کے ساتھ نازل ہُوا۔"

---

[14] ندوی، سید سلیمان، **مقالات سلیمان**، (اسلام آباد: نیشنل بک فاؤنڈیشن، ۱۹۹۰ء) حصہ سوم، ۵۲

[15] الاسراء: ۱۰۵

قصصِ قرآنی کی صداقت کے عصری اشارات کو تسلیم کرنے کے برعکس نو مسیحی پادریوں نے قرآن سے متعلق یہ اعتراضات ذکر کئے کہ اس میں مذکور قصص بائبل کی معلومات سے مطابقت نہیں رکھتے اس لیے قرآن مجید کو کلام خدا تسلیم نہیں کیا جاسکتا۔ امرِ واقعہ یہ ہے کہ قرآن مجید نے بائبل کے قصص میں ہونے والی انسانی تحریف کو بے نقاب کیا ہے۔ بائبل میں شامل کتابوں کا سلسلہ ٔسند تو اپنے مصنفین تک متصل ثابت نہیں ہوتا، ان کُتب کا الہامی ہونا بھی ثابت نہیں، ان کُتب میں تو بے شمار باہمی اختلافات منظرِ عام پر آچکے ہیں، معنی و مراد میں اختلاف کے ساتھ ساتھ واقعاتی اور قصہ جاتی اختلاف بھی سامنے آئے ہیں، اس پسِ منظر میں قرآن کے قصص کا بائبل میں مذکور قصص سے مختلف و متضاد ہونا قابلِ اعتراض نہیں۔ مولانا رحمت اللہ کیرانویؒ کا تبصرہ ملاحظہ ہو:

"قرآنِ کریم کی یہ مخالفت ارادی اور قصدی ہے، اس سے یہ جتانا مقصود ہے کہ قرآن کے خلاف جو کچھ ہے، یا غلط ہے، یا تحریف شدہ ہے، یہ بات نہیں کہ یہ مخالفت سہواً ہوئی ہے۔"[16]

قصص سے متعلق قرآن مجید اور بائبل کے جن اختلافات کا تذکرہ مسیحی پادری کرتے ہیں اُن کی دو اقسام ہیں۔ پہلی قسم میں وہ قصص شامل ہیں جو قرآنِ مجید نے تو بیان کئے ہیں مگر بائبل اُن کا تذکرہ نہیں کرتی۔ دوسری قسم اُن قصص کی ہے جو قرآن و بائبل یعنی دونوں کُتب میں موجود تو ہیں مگر اُن قصص کی نوعیّت و تفصیل بالکل مختلف ہے۔ پہلا اعتراض تو بالکل بے وزن ہے کیونکہ بائبل و قرآن کے قصص کا تقابل کرنے سے قبل پادری صاحبان کو عہد نامہ قدیم اور عہد نامہ جدید پر غور و فکر کرنا چاہیے۔ حقیقت تو یہ ہے کہ عہد نامہ جدید کے بہت سے قصص کا عہد نامہ قدیم میں کوئی تذکرہ نہیں۔ مولانا رحمت اللہ کیرانویؒ نے ان میں سے صرف تیرہ قصص کو باحوالہ انداز میں "اظہار الحق" میں تحریر کیا ہے۔[17] دوسرا اعتراض یہ تھا کہ قصصِ قرآن اور قصصِ بائبل باہم مختلف ہیں، ان کی نوعیّت اور دیگر تفصیلات میں تعارض و تضاد ہے۔ یہ اعتراض بھی بے جا اور مبنی بر تعصُّب ہے۔ قصص کی نوعیّت اور دیگر احوال کا اختلاف تو عہد نامہ قدیم اور عہد نامہ جدید کے درمیان بھی پایا جاتا ہے، انجیل کی مختلف کُتب میں بعض قصص کی تفصیلات مختلف ہیں، توریت کے تین نسخے یعنی عبرانی، یونانی اور سامری، باہم مختلف ہیں۔ اس پسِ منظر میں پادریوں کے اعتراضات محض مغالطہ پیدا کرنے اور تشکیک کو جنم دینے کی کوششیں ہیں۔ مولانا رحمت اللہ کیرانویؒ نے بائبل کے چھبیس قصص کے داخلی اختلافات کو تفصیل سے باحوالہ

---

[16] کیرانوی، رحمت اللہ، اظہار الحق، مترجم: تقی عثمانی، **بائبل سے قرآن تک**، (کراچی: دارالعلوم، ۲۰۱۰ء)، ۲: ۳۹۰

[17] م، ن، ۳۹۱

انداز میں بیان کیاہے۔[18] ڈاکٹر ابرہیم دیشکھ کو اسلام سے دل برداشتہ ہونے سے قبل دفاعِ اسلام کے ضمن میں لکھے گئے اس عظیم علمی سرمایہ سے ضرور استفادہ کرناچاہیے تھا۔ قرآنِ مجید کے قصص سے متعلق اُس کے اشکالات کے تجزیہ سے یہ بات سامنے آتی ہے کہ یہ قصص علم وعرفان کاخزانہ اور ہدایت ورہنمائی کا بیش قیمت سامان ہیں۔اس پسِ منظر میں اس کے قرآنِ مجید کے قصص پر اعتراضات نہایت کمزور علمی بنیاد کے حامل اور عقل کی میزان میں بڑے ہلکے ہیں۔

بائبل کی تحریف و تنسیخ کے قرآنِ مجید میں مذکور نہ ہونے کا اعتراض:

ڈاکٹر ابراہیم دیشکھ نے اپنے فہم کے مطابق قرآن مجید میں ان حوالہ جات کو تلاش کیا جو بائبل سے متعلق تھے۔اس نے قرآنی موقف کی جو تعبیر پیش کی اس کے مطابق تمام کتب سماویہ درست حالت میں موجود ہیں اور منبعِ رحمت وہدایت ہیں۔اُس نے لکھا:

۱۔ "قرآن مجید اقرار کرتا ہے کہ اللہ تعالیٰ نے پہلے نبیوں اور پیغمبروں پر اپنا کلام نازل کیا جس میں سے کچھ کتاب کی شکل میں لکھا گیا۔ قرآن مجید پہلی سبھی آسمانی کتابوں کی صداقت اور ان کے مستند ہونے کی گواہی دیتا ہے اور یہ دعویٰ کرتا ہے کہ یہ سبھی آسمانی کتابیں اہل جہاں کے لئے ہدایت، رحمت اور روشنی ہیں اور ہر شخص ان پر ایمان لائے(۲: ۵، ۴، ۹۱، ۹۷، ۱۳۶، ۲۵۸، ۳: ۴، ۱۳۶، ۱۶۳، "۵ : ۴۴، ۴۶، ۴۷، ۶۶۔ ۶: ۹۳، ۱۵۵، ۷ ۱۴۵، ۱۰ :۳۸وغیرہ)

۲۔ جس وقت قرآن مجید نازل ہوا اس وقت یہ سبھی آسمانی کتابیں موجود تھی۔ یہود اور مسیحی نہ صرف ان کی تلاوت کرتے تھے بلکہ انہیں نہایت غور سے پڑھتے تھے، اپنی اولاد کو سکھاتے تھے اور ان پر نہایت پابندی سے عمل پیرا تھے۔یہی وجہ ہے کہ جو قرآن مجید ان دو قوموں کو قارئین کتاب یا(اہلِ کتاب) کے نام سے مخاطب کرتا ہے،(۲: ۴۴، ۱۱۳، ۱۲۱ - ۳: ۷۸، ۷۹۔ ۵: ۴۳۔ ۶ : ۹۲۔ ۷: ۱۵۷۔ ۱۰ :۹۵وغیرہ)۔نہ کہ جھوٹی آسمانی کتابیں پڑھنے والے یا اہلِ کتاب جن کی کتابیں لغو ہیں جیسا کہ مجھے بتایا گیا تھا۔

۳۔ یہود اور مسیحی توریت اور انجیل کے احکام کے پابند رہیں جن کے علاوہ ان کے پاس کوئی ہدایت نہیں ہے(۵: ۶۵، ۶۹)۔

۴۔ بنی اسرائیل توریت کے مطابق انصاف کریں۔(۵: ۴۳)۔

۵۔ مسیحی انجیل کے مطابق انصاف کریں:

وَلْيَحْكُمْ أَهْلُ الْإِنْجِيلِ بِمَا أَنْزَلَ اللَّهُ فِيهِ وَمَنْ لَمْ يَحْكُمْ بِمَا أَنْزَلَ اللَّهُ فَأُولَئِكَ هُمُ الْفَاسِقُونَ[19]

---

[18] م،ن،۳۹۸-۴۱۴

[19] المائدہ:۴۷

"اور اہلِ انجیل کو چاہیے کو جو احکام اس میں خدا نے فرمائے ہیں ان کے مطابق حکم دیا کریں اور جو خدا کے نازل کئے ہوئے احکام کے مطابق حکم نہ دے گا، تو ایسے لوگ نافرمان ہیں۔"

۶۔ قرآن مجید میں پہلی آسمانی کتابوں کا پیغام دہرایا گیا ہے (۲۶: ۱۹۲،۱۹۷)۔

۷۔ اگر اہلِ عرب کو حضرت محمد کے لائے ہوئے پیغام (قرآن مجید) پر کسی قسم کا شک وشبہ ہو تو وہ اہل کتاب سے دریافت کریں (۱۶: ۴۳)۔

۸۔ اگر حضرت محمد خود قرآن مجید کی صداقت پر کسی کے شک وشبہ میں مبتلا ہوں تو آپ بھی ان لوگوں سے دریافت کریں جو پہلی آسمانی کتابیں پڑھتے ہیں (۱۰: ۹۵۔۶: ۱۱۵سے موازنہ کیجئے)۔

۹۔ تاہم قرآن مجید میں چند ناخوشگوار مشاہدات بھی پائے جاتے ہیں جو اہلِ کتاب سے اور ان کے پہلی آسمانی کتابوں کے واضح استعمال سے تعلق رکھتے ہیں جن کے لئے انہیں ذمہ دار قرار دیا گیا۔(۲ :۴۰، ۴۲، ۷۹، ۱۰۱، ۱۴۶ ـــــــــــــــــ وغیرہ)ان آیات کے مطالعہ سے گمان ہوتا ہے کہ اہل کتاب نے اپنی مقدس کتابوں میں تبدیلی (تحریف) کی تھی۔۔انہوں نے ان کتابوں کے متن کے کچھ حصے خارج (تخریج) کردیئے تھے یا انہیں چھپادیا تھا، وہ سچ کو جھوٹ کے ساتھ ملادیا تھا۔ دراصل زیادہ سنگین الزامات خصوصاًیہود کے خلاف لگائے گئے ہیں۔"[20]

مصنف کا تجزیہ ہے کہ قرآن نے بائبل کی تحریف کا کوئی تذکرہ نہیں کیا، اگر قرآن بائبل کو محرف کتاب خیال کرتا تو کبھی اُس کے تقدس کو بیان نہ کرتا، کیونکہ ان دنوں یہود ونصاریٰ تورات وبائبل کا مطالعہ کیا کرتے تھے، کس طرح کسی خراب کتاب کی تصدیق قرآن مجید کرسکتا ہے، وہ مختلف قسم کے سوالات اُٹھاتا ہے، قرآن نے کُتب سابقہ کی صداقت اور وجود کا کیوں اعتراف کیا، کیا اہلِ کتاب جعلی اور منحرف کتب پڑھتے پڑھاتے تھے، قرآن نے ان کُتب کے مطابق عدل کرنے کی تاکید کیوں کی، ان سوالات کے اندراج کے بعد وہ لکھتا ہے کہ ان تجزیات کے دو نتائج ہی ممکن تھے، پہلا یہ کہ قرآن مجید اپنے موقف کی خود ہی تردید کرتا ہے، دوسرا یہ کہ قرآن نے تحریف کا یہ معنی بیان کیا ہے کہ متن کا غلط یا ناجائز استعمال ہو رہا ہے، یا اس میں کسی بات کا اضافہ کر دیا جائے، یا اس کا ترجمہ غلط کیا جائے، یا متن کی تشریح غلط کی جائے، اُس نے سوال اُٹھایا ہے کہ کیا دُنیا کے مختلف حصوں اور علاقوں میں رہنے والے یہودی اور مسیحی یہ خواہش رکھ سکتے ہیں کہ وہ اپنی مقدس کتب کو تبدیل کردیں اور وہ بھی طے کریں کہ ان کتب میں کیا تبدیل کریں، کیا یہ تبدیلی تمام متعلقین کے ایک جگہ جمع ہوئے بغیر

[20] دیشکھ، ابراہیم خان عمر خان، **جستجوئے حق**، ۱۳-۱۵

ممکن ہے، ایک وقت میں ایک جگہ تمام لوگوں کا جمع ہونا ممکن نہیں، یہ ایک غیر عقلی بات ہے۔ لہذا عوامی نفسیات کا تقاضا ہے کہ یہ تسلیم کر لیا جائے کہ بائبل میں تحریف ممکن نہیں علاوہ ازیں قرآن میں بائبل کے منسوخ ہونے کا کوئی ذکر نہیں۔[21] زیادہ مناسب ہوتا کہ مصنف تحریف و تنسیخِ بائبل سے متعلق مسلم علماء کی بیش قیمت آراء و تجزیات پر مشتمل کُتب کا مطالعہ کرتا، ان کتب میں عقلی و نقلی دلائل کی روشنی میں بائبل کی تحریف اور تنسیخ کو موضوعِ بحث بنایا گیا ہے۔

عیسائی علماء بائبل کے الہامی ہونے کے دعویدار ہیں لیکن اگر عمومی نظر سے بھی دیکھا جائے تو اندازہ ہوتا ہے کہ یہ الہامی نہیں بلکہ بعد کے دور میں روایات کے ذریعے اکٹھی کی گئی ہے۔ عہد قدیم تو ویسے بھی روایات کی صورت میں نقل کیا گیا لیکن عہد جدید یعنی اناجیل اربعہ میں جس انداز سے یسوع مسیح کی پیدائش، نسب نامے اور حتیٰ کہ ان کی مزعومہ موت کا ذکر کیا گیا ہے اس سے یہ تو یقیناً ثابت ہوتا ہے کہ یہ واقعات وحی کا حصہ نہیں ہیں۔ پروفیسر ساجد میر نے ان پر تحقیقی نگاہ ڈالتے ہوئے تجزیہ پیش کیا ہے:

"انجیل متیٰ مسیح کے نسب نامہ کے بیان سے انجیل مرقس ان کے بارے میں پہلے انبیاءؑ کی پیش گوئیوں سے شروع کر کے اور انجیل یوحنا نو فلاطونی و غناسطی انداز سے ابتداء کر کے بغیر الہام کا دعویٰ کیے مسیح کے حالات بیان کرتی ہیں۔ 'رسولوں کے اعمال' میں بھی الہام کا دعویٰ کیے بغیر حواریوں اور ابتدائی کلیسا کے حالات ہیں۔ اس کے بعد پولس وغیرہ کے خطوط ہیں جس نے 'رسالت' اور مکاشفات کے عمومی دعوے تو کیے ہیں مگر اس کا یہ مطلب کسی طرح نہیں بنتا کہ خطوط میں جو اس نے لکھا وہ سارے کا سارا الہامی ہے۔ اس نے اور دیگر مکتوب نگاروں نے تو مختلف علاقوں اور کلیساؤں میں پیش آمدہ مسائل اور کچھ عمومی باتوں پر اظہار خیال کیا ہے۔"[22]

غرضیکہ خود اناجیل کے مضامین اس بات کے عکاس ہیں کہ یہ کتب الہامی نہیں بلکہ بعد میں تصنیف کی گئی ہیں۔ لیکن اگر اس سوال کو وقتی طور پر نظر انداز بھی کر دیا جائے تو بھی آخر ان کُتب کو جن شخصیات کی طرف منسوب کیا جاتا ہے ان تک سند ثابت شدہ ہے یا نہیں؟ اور وہ کس حد تک قابل اعتماد ہیں، اس جیسے دیگر سوالات کو نظر انداز نہیں کیا جا سکتا ہے۔ پروفیسر ساجد میر تحریر کرتے ہیں:

"بائبل کی متعدد کتابوں کو جن شخصیات سے منسوب کیا گیا ہے، ان سے ان کتابوں کا انتساب ہی ثابت نہیں ہوتا۔ یعنی وہ ان کے مصنف ہی نہیں اور دراصل تاریخ سے ان سوالات کا درست جواب حاصل کرنا ممکن نہیں کہ کن

---

[21] م،ن، ۱۷، ۱۶

[22] ساجد میر، پروفیسر، **عیسائیت: تجزیہ و مطالعہ**، (لاہور: دارالسلام، ۲۰۱۰ء)، ۲۴۸

لوگوں نے کب بائبل کو مرتب کیا اور وہ کہاں تک قابل اعتماد تھے۔ تاریخ ان سوالات کا جتنا کچھ جواب دیتی ہے اس سے بائبل کی الہامی واستنادی حیثیت مزید مشکوک ہو جاتی ہے۔"[23]

قطع نظر اس بات کے کہ بائبل کس حد تک الہام شدہ اور یا کن قابل اعتماد مصنفین کے ذریعے تحریر کی گئی، اگر تاریخی پس منظر کو پیشِ نظر رکھ کر دیکھا جائے کہ اس تاریخی کتاب کا کوئی قدیم نسخہ دستیاب ہے اور وہ کس دور کا ہے تو بھی اس کا کوئی ثبوت نہیں ملتا۔ پروفیسر ساجد میر تحریر کرتے ہیں:

"بائبل کے دونوں حصے سینکڑوں برس کے عرصہ کے دوران اور مختلف اوقات میں لکھے گئے۔ اس لئے ان میں سے ہر کتاب کا اصل نسخہ ملنا تو ناممکن ہے مگر مجموعی طور پر بائبل یا اس کے دونوں بڑے حصوں میں سے کسی ایک حصہ کا ایسا نسخہ بھی مکمل حالت میں دستیاب نہیں جسے ارباب کلیسا یا مجالس علمائے یہود و مسیحین نے اصلی و مستند قرار دیا ہو۔"[24]

غرضیکہ اناجیل الہامی کُتب نہیں ہیں بلکہ انسانی تصنیف کے طور پر بھی دیکھا جائے تو ان کے مصنفین کو قطعی طور پر تلاش نہیں کیا جاسکتا۔

قرآن مجید کے تاریخی پسِ منظر، جمع وتدوین اور طرزِ بیان پر اشکالات:

قرآن مجید کا دعویٰ ہے کہ وہ کلام اللہ ہے، اللہ اپنی بات کو تبدیل نہیں کرتا، قرآن میں بے ربطی اور اختلاف بیانی نہیں ہے۔ ڈاکٹر ابراہیم دیشمکھ نے قرآن کے ان دعوؤں کو غلط ثابت کرنے کی کوشش کی ہے۔ وہ لکھتا ہے:

"لیکن کیا قرآن مجید کا تاریخی پسِ منظر، اس کا طرزِ بیان اور اس میں درج کیا ہوا پیغام ان دعوؤں کی تصدیق کرتے ہیں جو وہ اپنے حق میں کرتا ہے؟ قرآن مجید کے مطالعہ کے دوران پیش آنے والی چند دشواریاں تو ہم اس سے قبل بیان کر ہی چکے ہیں۔ سر دست کچھ اور دشواریاں یہاں پیش کرتے ہیں جنہیں نظر انداز نہیں کیا جاسکتا۔ جیسے: اکثر آیات کے نزول کی وجوہات اور تاریخی پسِ منظر کی عدم تفصیل، آیات کی تاریخی ترتیب کا غلط سلیقہ، بعض بیانات میں تاریخی غلطیوں کے امکانات، بعض اوقات چند بیانات میں خیالات کے تسلسل میں اچانک بے ربطی واقع ہونا جیسے کسی ایک واقعہ کے بیان میں اچانک کسی نئے مضمون کا وارد ہونا وغیرہ۔"[25]

---

[23] م،ن، ۲۵۲

[24] پروفیسر ساجد میر، **عیسائیت: تجزیہ و مطالعہ**، ۲۷۷

[25] دیشمکھ، ڈاکٹر ابراہیم، **جستجوئے حق**، ۲۳

مصنف کا موقف ہے کہ قرآن ایک بے ربط، تاریخی ترتیب سے عاری اور واقعات کی تفصیل سے خالی کتاب ہے۔اُس نے قرآن مجید کی جمع وتدوین کی تاریخ پر ابہامات واضح کرتے ہوئے لکھا ہے:

"حضرت عثمان کے عہد میں قرآن مجید کے مختلف نسخے اکٹھے کئے گئے جن کی مدد سے موجودہ نسخہ مرتب کیا گیا۔ کیا اس سلسلہ میں دستیاب ہونے والی روایات مسلمانوں کے اس حسب معمول یقین دہانی کی تائید کرتی ہیں کہ قرآن مجید کا موجودہ نسخہ ہو بہو وہی قرآن ہے جو حضرت محمد پر نازل ہوا تھا؟ جو شخص قرآن مجید کی آیات کا تاریخی پس منظر جاننے کا خواہاں ہو وہ اس کتاب کے ان حصوں یا آیات کو بھی جاننا چاہے گا جنہیں روایات کے مطابق حضرت عثمان نے تصحیح کرنے کے بعد ضائع کر دیا تھا۔ کیا وہ یہ بھی جاننا نہ چاہے گا ان آیات کے وجود اور ان کے وقت ضائع کئے جانے کی وجوہات کیا تھیں؟ کیا قرآن مجید کی ان قدیم، مختلف قراتوں کو یونہی بھلا دیا جائے جو معتبر اور مشہور اسلامی تصانیف میں آج بھی پائی جاتی ہیں حالانکہ قرآن مجید کے وہ حصے اس وقت ضائع کر دئے گئے تھے؟ اگر انسان کا حافظہ حضرت عثمان کے مرتب کئے ہوئے قرآن مجید کی آیات کو یاد کر سکتا ہے تو کیا اس کی یادداشت ان مختلف قراتوں کو بھی یاد نہیں رکھ سکتی جنہیں دوسروں نے قلمبند کیا خصوصاً آنحضرت کے ان صحابہ کرام کی یاداشت جو یہ دعویٰ کرتے تھے کہ وہی صحیح آیات تھیں؟ میں یہ جانتا تھا کہ اکثر اوقات ایسے مدلل سوالات مسئلہ پر معقول روشنی ڈالنے کی بجائے جذبات کو زیادہ بھڑکاتے ہیں۔ لیکن ان پر ٹھنڈے دل سے غور بھی تو کیا جا سکتا ہے؟ آخر اس میں حرج ہی کیا ہے جب کہ بیشتر مسلمان یہ اصرار کرکے آنحضرت کے زمانہ سے آج تک قرآن مجید کا مکمل تحفظ کیا گیا ہے، ایسے سوالات کی دعوت دیتے ہیں؟"[26]

نو مسیحی مصنفین کے بہت سے اشکالات کا بلاواسطہ یا بالواسطہ تعلق قرآنِ مجید کی حفاظت اور اس کی جمع وتدوین سے ہے۔اس کا پسِ منظر یہ ہے کہ مسلم علماء ومناظرین نے مسیحیوں پر جو اعتراضات کئے تھے اُن میں سے سب سے اہم "تحریفِ بائبل" تھا۔ مسلمانوں کا نقطۂ نظر یہ ہے کہ بائبل کی روایات غیر مستند اور غیر معتبر ہیں، بائبل کی جمع وتدوین کا کوئی قابلِ اعتبار ریکارڈ دستیاب نہیں۔ مسلم علماء کے اس موقف کے ردِّ عمل میں مسیحی پادریوں نے قرآنِ مجید کی صحت وحفاظت پر اعتراضات کیے۔ پادری سی-جی-فانڈر نے اس ضمن میں لکھا: "اگر مسیح کے صعود کے بعد اناجیل کا لکھا جانا قابل اعتراض ہے تو یہی اعتراض قرآن شریف کے متعلق بھی کیا جا سکتا ہے۔ قرآن بھی تو جیسا مشکوٰۃ المصابیح اور دیگر مستند کُتب اسلامیہ میں مرقوم ہے، حضرت محمد ﷺ کی وفات کے بعد جمع کیا گیا تھا۔"[27]

---

[26] م،ن، ۲۴

[27] سی-جی-فانڈر، پادری، **میزان الحق**، (لاہور: پنجاب ریلجئس بک سوسائٹی، ۱۹۶۲ء)، ۱۰۴

مسیحی پادریوں کے جمع وتدوینِ قرآن پر اعتراضات سے کمزور ایمان کے حامل مسلمان منفی طور پر متاثر ہوئے۔ڈاکٹر ابراہیم خان عمر خان دیشمکھ مطالعۂ قرآن کے دوران قرآن کے تاریخی پسِ منظر اور اس کی حفاظت کے مختلف مراحل کے بارے میں ابہامات کا شکار ہوگئے۔وہ لوحِ محفوظ پر قرآن مجید کے لکھے جانے پر بھی اعتراض کرتے رہے،اُن کا خیال ہے کہ قرآنِ مجید کی بہت سی آیات کے نُزول کی وجوہات واضح نہیں کی گئیں،بہت سے واقعاتِ قرآن میں تاریخی پسِ منظر کی تفصیل درج نہیں کی گئی۔اُس کا موقف ہے کہ بعض آیات کی تاریخی ترتیب کا طریقہ وسلیقہ غلط ہے، بعض آیات میں تاریخی اغلاط کے امکانات ہیں،اُس کا فہم ہے کہ بعض اوقات قرآن میں تاریخی ربط قائم نہیں رہتا۔اُس نے عہدِ عثمانی میں قائم کی جانے والی ترتیب کو عہدِ رسالت کی ترتیب سے مختلف قرار دیا ہے۔[28] مسیحی مصنفین کے ان اشکالات کے برعکس مسلمانوں کا موقف یہ ہے کہ قرآنِ مجید کی حفاظت اللہ تعالیٰ کی ذمہ داری ہے۔

ارشادِ ربانی ہے:

إِنَّا نَحْنُ نَزَّلْنَا الذِّكْرَ وَإِنَّا لَهُ لَحَافِظُونَ[29]

"بے شک اس نصیحت کو ہم نے ہی نازل کیا اور ہم ہی اس کے محافظ ہیں۔"

اس میں کسی غلطی یا تبدیلی کا کوئی امکان نہیں۔[30] حفاظتِ قرآن کے لئے مسلمانوں نے کتابت اور حفظ دونوں اسالیب کو اختیار کیا۔حفظِ قرآن پر یہ قرآنی شہادت موجود ہے:

بَلْ هُوَ آيَاتٌ بَيِّنَاتٌ فِي صُدُورِ الَّذِينَ أُوتُوا الْعِلْمَ وَمَا يَجْحَدُ بِآيَاتِنَا إِلَّا الظَّالِمُونَ[31]

"قرآن روشن وواضح آیات کا مجموعہ ہے،یہ علم والوں کے سینوں میں موجود ہے۔"

کتابت کے ذریعے قرآن کی حفاظت کا سامان کرنے کی مسلمانوں کی بالغ نظر کاوش کا تذکرہ قرآن نے اس طرح کیا:

وَالطُّورِ* وَكِتَابٍ مَسْطُورٍ* فِي رَقٍّ مَنْشُورٍ[32]

"قرآنِ حکیم ایسی کتاب ہے جو کشادہ اوراق میں لکھی ہوئی ہے۔"

---

[28] دیشمکھ،ابراہیم خان عمر خان، **جستجوئے حق**،۲۳-۲۴

[29] الحجر:۹

[30] حم السجدہ:۴۲

[31] العنکبوت:۴۹

[32] الطور:۱-۳

دوسرے مقام پر فرمایا:

إِنَّهُ لَقُرْآنٌ كَرِيمٌ* فِي كِتَابٍ مَكْنُونٍ* لَا يَمَسُّهُ إِلَّا الْمُطَهَّرُونَ* تَنْزِيلٌ مِنْ رَبِّ الْعَالَمِينَ [33]

"قرآنِ مجید عزت والی چیز ہے جو محفوظ کتاب میں لکھی ہوئی ہے، اس کو پاک لوگ چھوتے ہیں اور یہ تمام جہانوں کے پالنے والے کی طرف سے نازل کی گئی ہے۔"

عہدِ رسالت میں کتابتِ قرآن کے بہت سے شواہد کُتبِ حدیث وسیرت میں ملتے ہیں۔ حضرت عمر فاروق کے قُبولِ اسلام کے وقت بھی قرآن کے لکھے ہُوئے موجود ہونے کا ثبوت ملتا ہے۔[34] رسول اللہ ﷺ کا فرمان ہے:

"جبرائیلؑ نے مجھے کہا کہ میں اس آیت کو جو فلاں سورت کی ہے، اُسے فلاں مقام پر لکھ لوں، وہ مندرجہ ذیل آیت تھی: إِنَّ اللَّهَ يَأْمُرُ بِالْعَدْلِ وَالْإِحْسَانِ[35]

حضرت زید بن ثابت سے روایت ہے:

"عَنْ زَيْدِ بْنِ ثَابِتٍ قَالَ: كُنْتُ أَكْتُبُ الْوَحْيَ لِرَسُولِ اللَّهِ صَلَّى اللهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ، وَكَانَ «إِذَا نَزَلَ عَلَيْهِ أَخَذَتْهُ بُرَحَاءُ شَدِيدَةٌ، وَعَرِقَ عَرَقًا شَدِيدًا مِثْلَ الْجُمَانِ، ثُمَّ سُرِّيَ عَنْهُ» ، فَكُنْتُ أَدْخُلُ عَلَيْهِ بِقِطْعَةِ الْكَتِفِ أَوْ كِسْرَةٍ، فَأَكْتُبُ وَهُوَ يُمْلِي عَلَيَّ، فَمَا أَفْرَغُ حَتَّى تَكَادَ رِجْلِي تَنْكَسِرُ مِنْ ثِقَلِ الْقُرْآنِ، وَحَتَّى أَقُولَ: لَا أَمْشِي عَلَى رِجْلِي أَبَدًا، فَإِذَا فَرَغْتُ قَالَ: «اقْرَأْهُ» ، فَأَقْرَؤُهُ، فَإِنْ كَانَ فِيهِ سَقْطٌ أَقَامَهُ، ثُمَّ أَخْرُجُ بِهِ إِلَى النَّاسِ"[36]

"میں رسول اللہ ﷺ کے لیے وحی کی کتابت کیا کرتا تھا۔ جب آپ ﷺ پر وحی نازل ہوتی تو آپ کو سخت گرمی لگتی تھی۔ آپ ﷺ کے جسمِ اطہر پر پسینہ کے قطرے موتیوں کی طرح ڈھلکنے لگتے تھے۔ پھر آپ ﷺ پر یہ کیفیت ختم ہو جاتی تو میں مونڈھے کی کوئی ہڈی یا کسی اور چیز کا ٹکڑا لے کر خدمت میں حاضر ہوتا۔ آپ ﷺ لکھواتے اور میں لکھتا جاتا۔ یہاں تک کہ جب میں لکھ کر فارغ ہو جاتا تو قرآن لکھنے کے بوجھ سے مجھے ایسا محسوس ہوتا جیسے میری ٹانگ

---

[33] الواقعہ:۷۷-۸۰

[34] أبو الحسن علي بن عمر بن أحمد بن مهدي بن مسعود بن النعمان بن دينار البغدادي الدارقطني (م۳۸۵ھ)، السنن، باب فی نہی المحدث عن مس القرآن(جامعة أم القرى،۱۴۲۰)،۱۲۳:۱؛ أبو الحسن نور الدين علي بن أبي بكر بن سليمان الهيثمي (م۸۰۷ھ)، مجمع الزوائد،(القاهرة: مكتبة القدسي،۱۴۱۴)،۹: ۶۱

[35] النحل۱۶: ۹۰؛ أبو عبد الله أحمد بن محمد بن حنبل بن هلال بن أسد الشيباني، مسند(قاہرہ: دارالحدیث،۱۴۱۶ھ)ج:۳،ص:۲۸۶

[36] سليمان بن أحمد بن أيوب بن مطير اللخمي الشامي، أبو القاسم الطبراني(م۳۶۰ھ)، المعجم الأوسط(القاهرة: دار الحرمين، س۔ن)،۲: ۲۵۷

ٹوٹنے والی ہے اور میں کبھی چل نہیں سکوں گا۔ جب میں فارغ ہو جاتا تو آپ ﷺ فرماتے کہ پڑھو۔ میں پڑھ کر سناتا، اگر لکھائی میں کوئی فروگزاشت ہوتی تو آپ اس کی اصلاح فرما دیتے، پھر میں اس کو لے کر لوگوں کی طرف آجاتا۔"

اس ضمن میں امام ترمذیؒ کی روایت ملاحظہ ہو:

"فقال عثمان كان رسول الله صلى الله عليه وسلم مما يأتي عليه الزمان وهو ينزل عليه السور ذوات العدد، فكان إذا نزل عليه الشيء دعا بعض من كان يكتب فيقول: «ضعوا هؤلاء الآيات في السورة التي يذكر فيها كذا وكذا» وإذا نزلت عليه الآية فيقول: «ضعوا هذه الآية في السورة التي يذكر فيها كذا وكذا»"[37]

"حضرت عثمان سے روایت ہے کہ حضور ﷺ کا معمول مبارک تھا کہ جب کبھی ایک یا ایک سے زائد سورتیں نازل ہوتیں تو آپ ﷺ کسی کاتب کو بُلاتے اور فرماتے کہ یہ آیات فلاں سورت میں شامل کردو۔ اسی طرح جب کوئی آیت نازل ہوتی تو اس کے بارے میں فرمادیتے کہ اسے فلاں سورت میں فلاں جگہ شامل کردو۔"

حفاظتِ قرآن کے لیے کتابت کے ساتھ ساتھ حفظ کے طریقہ پر بھی مسلمانوں نے خوب توجہ دی۔ کُتبِ حدیث وسیرت میں حفاظِ قرآن کے اسمائے گرامی جابجا ملتے ہیں۔[38] خُود حضور ﷺ نے جبرائیلؑ کے ساتھ مل کر کئی مرتبہ قرآن مجید کا دور فرمایا۔[39] حفاظتِ قرآن نہایت اہم معاملہ تھا۔ قرآن مجید کی کتابت کے بارے میں علامہ سیوطیؒ نے لکھا ہے کہ خُود حضور ﷺ قرآن کو لکھنے کا حکم دیتے تھے۔ یہ ایک واقعاتی امر ہے کہ اُس وقت قرآن متفرق ٹکڑوں پر لکھا ہُوا تھا۔[40] ایسی روایات بھی دستیاب ہیں جن کے مطابق حضرت عائشہ کے پاس قرآنی نسخہ موجود تھا۔ بخاری میں درج روایت کے مطابق اس نسخہ کی زیارت کے لیے ایک شخص عراق سے مدینہ آیا تھا۔[41] اسلامی تعلیمات کی رُو سے

---

[37] الترمذي، محمد بن عيسى بن سَوْرة بن موسى بن الضحاک، الترمذي، أبو عيسى (م ۲۷۹ھ)، **سنن**، (مصر: شركة مكتبة ومطبعة مصطفى البابي الحلبي، ۱۳۹۵ھ)، ۵: ۲۷۲

[38] ابنِ الجزری، النشر فی القرأت العشر، ۱: ۶؛ عبد الرحمن بن أبي بكر، جلال الدين السيوطي (م ۹۱۱ھ)، **الاتقان**، (مصر: الهيئة المصرية العامة للكتاب، ۱۳۹۴ھ)، ۱: ۷۴، ۷۳

[39] محمد بن إسماعيل أبو عبدالله البخاري الجعفي، الجامع الصحيح، **كتاب فضائل القرآن**، باب جبريل يعرض القرآن على النبی ﷺ، (دار طوق النجاة، ۱۴۲۲ھ)، حديث: ۴۹۹۸-۴۹۹۷

[40] السيوطی، الاتقان، النوع الثامن عشر

[41] بخاری، الجامع الصحیح، **کتاب فضائل القرآن**، باب تالیف القرآن، حدیث: ۴۹۹۳

قرآنِ مجید کی تلاوت کا ثواب ہے۔ حضور ﷺ کی احادیث میں ذکر کیا گیا کہ ناظرۂ قرآن کی ترغیب دی جائے۔ ناظرے کی ترغیب کا مطلب یہ ہے کہ قرآن کتابی صورت میں موجود تھا۔ اس ضمن میں چند روایات پیش کی جاتی ہیں۔

۱۔ قرآن مجید کی زبانی تلاوت کا درجہ ایک ہزار ہے اور مصحف میں دیکھ کر تلاوت کرنا دو ہزار درجے رکھتا ہے۔[42]

۲۔ مصحف سے دیکھ کر پڑھنے کا اجر دو ہزار درجہ ہے اور مصحف سے دیکھے بغیر اجر ایک ہزار درجہ ہے۔[43]

۳۔ جو شخص قرآن حکیم کو دیکھ کر پڑھتا ہے اللہ تعالیٰ اس کی نظر کو تاحیات قوت عطا فرمائے گا۔[44]

تفسیر، حدیث اور سیرت سے متعلق کُتب میں ایسے صحابہ کے تذکار ملتے ہیں جن کے پاس قرآن مجید کے مکمل نسخے موجود تھے۔ حضرت معاذ بن جبل، حضرت زید بن ثابتؓ، حضرت ابی بن کعب، حضرت ابوزیدؓ، حضرت عقبہ بن عامر جہنیؓ، حضرت ابو بکر صدیقؓ، حضرت عثمانؓ، حضرت سعد بن عبیدؓ، حضرت عمر فاروقؓ، حضرت تمیم داری، حضرت ابوالدردہؓ، حضرت عبداللہ بن مسعودؓ، حضرت ابوایوب انصاری، حضرت علی بن ابی طالب اور حضرت عبادہ بن الصامت کے اسمائے گرامی اکثر کُتب میں درج ہیں۔[45] قرآنِ مجید کی حفاظت کی غرض سے حفظ اور زبانی تلاوت کی بھی ترغیب دی گئی۔ مختلف مواقع پر تلاوتِ قرآن کا اہتمام کیا جاتا۔ نماز میں تلاوت قرآن ضروری ہے، حضور ﷺ اسلام کی دعوت دیتے وقت قرآن کی چند آیات کی تلاوت کا اہتمام فرمایا کرتے تھے، مکتوبات تحریر کرتے وقت آیاتِ قرآنی ابتداء میں لکھی جاتی تھیں، وفود سے ملاقات کے وقت آیاتِ قرآن تلاوت کی جاتی تھیں، تعلیم و تربیت کے لیے قرآنی آیات کی تلاوت کی جاتی تھی، تلاوت کے علاوہ کثرت سے ایسے صحابہ موجود تھے جو قرآن مجید کے حافظ تھے۔ حفاظ کا ہر سطح پر خیال رکھا جاتا۔ شہدائے اُحد کی تدفین کے وقت پہلے اُن لوگوں کو دفن کیا گیا جنھیں نسبتاً زیادہ قرآن حفظ تھا۔[46]

---

[42] الحافظ أبي القاسم سُلَیمان بن أحمد الطَّبرَاني، (م ۳۶۰ھ)، **المعجم الکبیر**، (قاہرہ: مکتبہ ابن تیمیۃ، ۱۴۱۵ھ)، حدیث: ۶۰۱

[43] الخراسانی، ابو بکر البیہقی (م ۴۵۸ھ)، **شعب الایمان**، (الریاض: مکتبۃ الرشد)، ۳:۵۰۶، حدیث: ۲۰۲۵

[44] الرازی، ابوالفضل، فضائل القرآن وتلاوتہ، باب فی أن من نظر فی المصحف متعہ اللہ ببصرہ (مصر: دار الملایین، س۔ن)، ۱۸

[45] تفصیل کے لیے ملاحظہ ہوں: أبو الفضل أحمد بن علي بن محمد بن أحمد بن حجر العسقلاني (م ۸۵۲ھ)، **تہذیب التہذیب**، (الہند: مطبعۃ دائرۃ المعارف النظامیۃ، ۱۳۲۶ھ)، ۳:۲۴۳ :۷ ؛ بخاری، الجامعہ الصحیح، **کتاب فضائل القرآن**، باب القرآء من اصحاب رسول اللہ ﷺ، حدیث: ۵۰۰۴، ۵۰۰۳؛ ابنِ سعد، **الطبقات الکبریٰ**، (مصر: دار الکتب، س۔ن)، ۲: ۱۱۲

[46] محمد بن عیسی بن سَوْرۃ بن موسی بن الضحاک، الترمذي، أبو عیسی (م ۲۷۹ھ) السنن، **کتاب الجہاد**، باب ما جاء فی دفن الشہداء (بیروت: دار الغرب الإسلامي، ۱۹۹۸ء)، حدیث: ۱۸۲۷، ۱۷۱۳

ڈاکٹر ابراہیم دیشمکھ کا جمع وتدوینِ قرآن سے متعلق ایک اعتراض عہدِ عثمانی سے متعلق ہے۔ اُس کی طرف سے یہ خیال ظاہر کیا جاتا ہے کہ حضرت عثمان نے قرآن مجید کا اصل متن ضائع کر دیا تھا۔ یہ موقف حقائق کے منافی ہے اور لاعلمی پر مبنی ہے۔ اصل صورتِ حال یہ ہے کہ حضرت عثمان ملتِ اسلامیہ کے عظیم محُسن ہیں، آپ نے جمع وتدوینِ قرآن کا ایک اہم مرحلہ خُوش اُسلوبی سے انجام دیا۔ اسی وجہ سے آپ کو جامع القرآن کہا جاتا ہے۔ آپ کے تیار کردہ نسخے کی مدد سے تمام کے تمام سات حروف ہمیشہ کے لیے محفوظ کر دیے گئے۔ عہدِ عثمانی میں اس ساری کارکردگی کا پس منظر واضح کرتے ہوئے علوم القرآن اور مسلمانوں میں علمِ تفسیر کے ارتقاء پر گہری نظر رکھنے والے ممتاز اُستاذ و محقق پروفیسر ڈاکٹر حافظ محمود اختر لکھتے ہیں:

"حضرت عثمان کے دور تک اسلام عرب و عجم میں پھیل چکا تھا۔ صحابہ کرام نے حضور اکرم ﷺ سے مختلف حروف میں قرآن مجید پڑھا تھا۔ ان حضرات نے اسی انداز سے قرآن مجید اپنے شاگردوں کو پڑھایا۔ دور دراز کے لوگ اس حقیقت سے آگاہ نہ تھے کہ قرآن مجید کے بعض الفاظ ایک سے زیادہ طریقوں سے پڑھنے کی اجازت تھی۔ اسی بنا پر لوگوں میں جھگڑے کھڑے ہونے لگے۔ ایک شخص اپنی قرأت کو درست اور دوسرے کی قرأت کو غلط قرار دیتا۔ ان حالات میں اس بات کا خدشہ تھا کہ لوگ قرآن مجید کی متواتر قرأتوں کو غلط قرار دینے کی سنگین غلطی میں مبتلا ہو جائیں گے۔ دوسری طرف حضرت زید بن ثابت کے لکھے ہوئے نسخہ کے سوا پورے عالمِ اسلام میں کوئی نسخہ نہ تھا جو پوری اُمت کے لیے حجت بن سکے۔ اس نسخہ کے علاوہ باقی نسخے صحابہ کرام کے ذاتی نسخے تھے۔ ان میں سات حروف کو یکجا کرنے کا کوئی اہتمام نہ تھا۔ ہر کسی نے اپنی اپنی قرأت کے مطابق اپنا اپنا نسخہ تحریر کر رکھا تھا۔"[47]

مسیحی پادریوں کا اعتراض یہ ہے کہ حضرت عثمان نے سات قرأتوں میں سے چھ کو منسوخ کیا اور محض ایک کو قائم رکھا۔ یہ موقف کم فہمی پر مبنی ہے۔ سات قرأتوں سے مراد سات لہجے ہیں، یہ الفاظ کی ادائیگی کا انداز ہے، حضرت عثمان نے ایسا رسم الخط استعمال کیا جس میں وہ تمام قرأتیں سما گئیں۔ حضرت علیؓ نے اس عظیم خدمت پر حضرت عثمان کی بڑی ستائش فرمائی۔ فتح الباری کی روایت ملاحظہ ہو:

---

[47] حافظ محمود اختر، ڈاکٹر، پروفیسر، مضمون: قرآن حکیم اور دیگر کتب سماوی کی حفاظت –ایک تقابلی و تحقیقی مطالعہ، مرتبہ: ڈاکٹر جمیلہ شوکت (لاہور: شعبہ علومِ اسلامیہ جامعہ پنجاب، ۲۰۱۲ء)، ۱۲۵

"قَالَ عَلِيٌّ لَا تَقُولُوا فِي عُثْمَانَ إِلَّا خَيْرًا فَوَاللَّهِ مَا فَعَلَ الَّذِي فَعَلَ فِي الْمَصَاحِفِ إِلَّا عَنْ مَلَإٍ مِنَّا قَالَ مَا تَقُولُونَ فِي هَذِهِ الْقِرَاءَةِ لقد بَلغنِي أَن بَلَغَنِي أَنَّ بَعْضَهُمْ يَقُولُ إِنَّ قِرَاءَتِي خَيْرٌ مِنْ قِرَاءَتِكَ وَهَذَا يَكَادُ أَنْ يَكُونَ كُفْرًا قُلْنَا فَمَا تَرَى قَالَ أَرَى أَنْ نَجْمَعَ النَّاسَ عَلَى مُصْحَفٍ وَاحِدٍ فَلَا تَكُونُ فُرْقَةٌ وَلَا اخْتِلَافٌ قُلْنَا فَنِعْمَ مَا رَأَيْتَ-"[48]

"حضرت علی نے فرمایا کہ حضرت عثمانؓ کے بارے میں بھلائی کے علاوہ کوئی بات نہ کہو کیونکہ مصاحف کے بارے میں انہوں نے جو کیا وہ ہماری موجودگی میں کیا۔ انہوں نے ہم سب سے مشورہ کیا کہ ان قرأتوں کے بارے میں تمہارا کیا خیال ہے؟ کیونکہ مجھے اطلاعات مل رہی ہیں کہ بعض لوگ کہتے کہ میری قرأت تمہاری قرأت سے بہتر ہے۔ حالانکہ یہ ایسی بات ہے جو کُفر کے قریب تک پہنچتی ہے۔ اس پر ہم نے اُن سے کہا کہ پھر آپ کی رائے کیا ہے؟ انہوں نے فرمایا کہ میری رائے یہ ہے کہ ہم سب لوگوں کو ایک مصحف پر جمع کردیں تاکہ کوئی افتراق واختلاف باقی نہ رہے۔ ہم سب نے کہا کہ آپ نے بڑی اچھی رائے قائم کی۔"

پیش کردہ دلائل کے تناظر میں یہ کہنا درست ہوگا کہ غیر مسلموں خصوصاً مسیحی اہلِ قلم کو فکرِ اسلام کے مختلف پہلوؤں کا از سرِ نو مطالعہ کرنا چاہیے۔ اُن کے اکثر اعتراضات اُن کے عدمِ مطالعہ اور مذہبی تعصُّب کا نتیجہ ہیں۔ جمع وتدوینِ قرآن کی تاریخ مسلمانوں کی علمی دُنیا کا ایک اہم باب ہے۔ عہدِ رسالت سے لے کر آج تک قرآن اصل حالت میں محفوظ ہے۔ کسی قسم کی کوئی تبدیلی یا ترمیم اس میں نہیں کی جاسکتی۔ کتابت اور حفظ کے اسالیب کو اختیار کرکے مسلمانوں نے قرآن کو قیامت تک کے لیے محفوظ بنالیا ہے۔ دُنیا کی کوئی کتاب حفاظت کے اس اعلیٰ معیار کا دعویٰ نہیں کرسکتی۔ مسیحی پادریوں کو چاہیے کہ وہ قرآن کی صحت اور جمع وتدوین پر اعتراض کرنے سے قبل بائبل کی تدوین کی تاریخ پر سنجیدہ غوروفکر کریں۔

ڈاکٹر ابراہیم دیشمکھ کے اعتراضات میں قرآن کا طرزِ بیان بھی زیرِ بحث آیا۔ انہوں نے قرآن کے انداز واُسلوب پر سوالات اُٹھائے ہیں اور قرآن کو بے ربط کلام قرار دیا ہے، اُس کا شکوہ ہے کہ قرآن اکثر آیات کے نزول کی وجوہات کو بیان نہیں کرتا، آیات کے تاریخی پسِ منظر کی تفصیلات بہت کم ملتی ہیں، آیات کی بے ربطی کی نشاندہی اُس نے کی ہے۔ وہ کہتا ہے کہ ایک واقعہ کے بیان میں اچانک کوئی نیا مضمون وارد ہو جاتا ہے اور آیات کے بیان میں تاریخی ترتیب کا لحاظ بھی نہیں رکھا گیا۔[49] ان اعتراضات واشکالات میں بنیادی چیزیں دو ہی ہیں۔ ایک قرآن مجید کا اُسلوبِ بیان ہے اور

[48] العسقلاني، أحمد بن علي بن حجر أبو الفضل الشافعي، **فتح الباري شرح صحيح البخاري**، (بیروت: دار المعرفۃ، م۱۳۷۹ھ)، ۹: ۱۸

[49] دیشمکھ، ابراہیم خان عمر خان، ڈاکٹر، **جستجوئے حق**، ص: ۲۳

دوسری اس کی ترتیب ہے۔ ان دو اسباب کی وجہ سے مسیحی پادری کے موقف کے مطابق قرآن ایک بے ربط کتاب معلوم ہوتی ہے۔ مسیحی اہلِ علم کی رائے کے برعکس مسلمانوں کا موقف یہ ہے کہ قرآن کا اُسلوبِ بیان نہایت اعلیٰ وارفع اور بلاغت کے اعلیٰ ترین معیار پر قائم ہے۔ اس کی بلاغت انسانی صلاحیّت سے کہیں بلند ہے۔ مقامِ افسوس ہے کہ قرآن کے طرزِ بیان پر اعتراض کرنے والے مسیحی پادریوں کی خُود اپنی زبان بھی عربی نہ تھی پھر کس طرح انہوں نے قرآن کی ادبیّت اور چاشنی سے انکار کر دیا۔ قرآن ایسی منفرد کتاب ہے جس میں تذکیر و تانیث کے علاوہ مفرد، تثنیہ اور جمع کی غلطی تو بڑی دور کی بات ہے اس سے چھوٹی غلطی بھی کوئی تلاش نہیں کر سکا۔ قرآن کے الفاظ نہایت باوقار اور فصیح ہیں۔ اُن میں آج تک کسی شخص نے کسی قسم کی سطحیّت کی نشاندہی نہیں کی۔

قرآنِ مجید کے اُسلوبِ بیان اور طرزِ تخاطب میں بہت سے اعلیٰ اوصاف پائے جاتے ہیں۔ اس میں سچائی اور راست گوئی نمایاں طور پر نظر آتی ہے۔ قرآن کی کوئی بات آج تک جھوٹ ثابت نہیں ہو سکی۔ کسی انسان کا کلام نثر میں ہو یا نظم میں، سارے کا سارا فصیح نہیں ہو سکتا۔ قرآن کا یہ اعجاز ہے کہ یہ اوّل تا آخر فصاحت وبلاغت اور متانت و سنجیدگی کا عکاس ہے، ایک ہی واقعہ کو قرآن مختلف مقامات پر مختلف انداز میں بیان کرتا ہے، ہر مرتبہ مقصدیت اور لفظی حُسن کا التزام نظر آتا ہے۔ قصص وواقعات کے تکرار نے قرآن کی فصاحت کا معیار گرنے نہیں دیا۔ قرآن ہر موضوع پر یکتا واعلیٰ ہے۔ کسی بھی خطیب یا شاعر کو ایک ہی موضوع یا فن پر مکمل عبور حاصل ہوتا ہے۔ وہ اُس موضوع یا فن سے ہٹ جائے تو اُس کا کلام اپنی قدر واہمیت کھو دیتا ہے مگر قرآن کا اعجاز ہے کہ یہ خُوش خبری سُنائے یا اللہ کے عذاب سے ڈرائے، ترغیب ونصیحت کو بیان کرے یا کسی تاریخی حقیقت کو یاد کرائے، اس کی فصاحت بہر صورت قائم رہتی ہے۔ مولانا رحمت اللہ کیرانویؒ نے "اظہار الحق" کی جلد دوم میں قرآن مجید کی بلاغت کے چند نمونے ذکر کئے ہیں۔ ترغیب، ترہیب، دھمکی، ملامت، وعظ ونصیحت اور ذات وصفات کا بیان ایسے عنوانات درج کر کے متعلقہ آیات بیان کی ہیں۔ اُنہوں نے مختلف موضوعات پر قرآنی آیات کی آفاقیّت و سنجیدگی کو واضح کیا ہے۔[50]

ربطِ کلام قرآنِ مجید کا ایک معجزہ ہے، ایک ہی موضوع پر آیات مسلسل آرہی ہوں یا موضوع آئندہ آیات میں بدل جائے، قرآن اپنے ربط اور حُسنِ کلام کو قائم رکھتا ہے، یہ وصف انسانی عادت کے خلاف ہے اور اس بات کا ثبوت ہے کہ یہ کسی انسان کا کلام نہیں۔ امر ونہی کے بعد وعدہ ووعید کا ذکر آجائے تو دونوں میں بہترین ربط موجود ہو گا۔ ایک دوسرا

[50] کیرانوی، رحمت اللہ، مولانا، اظہار الحق، **قرآن سے بائبل تک**، مترجم: مولانا محمد تقی عثمانی، ۲: ۳۰۹-۳۱۱

وصف قرآن میں یہ ہے کہ یہ تھوڑے سے الفاظ میں بے شمار معانی کو بیان کر دیتا ہے، اس وصف سے اس کی معنویت میں ہی اضافہ نہیں ہوتا بلکہ اس کے حُسن اور لسانی مٹھاس میں بھی بڑھوتی ہوتی ہے، اس کے الفاظ کی ترکیب، آیات کا آغاز واختتام اور علم وعرفان کو بیان کرنے کا شائستہ انداز اپنی مثال آپ ہیں۔ اس کے باوقار اشارات، معتبر الفاظ، سادہ تراکیب اور دلچسپ ترتیب کو دیکھ کر بخوبی اندازہ ہو جاتا ہے کہ یہ کسی انسان کا کلام نہیں ہے۔ اس منفرد کلام میں کسی قسم کا سرقہ نہیں پایا گیا۔ ہر ادیب اور شاعر کوئی نہ کوئی غلطی کر دیتا ہے، قرآن لسانی ومعنوی اغلاط سے پاک ہے، اس کی پیشگوئیاں تمام کی تمام درست ثابت ہوئی ہیں۔

ڈاکٹر ابراہیم دیشمکھ قرآنِ مجید کے اس اعجازی پہلو کو سمجھنے سے قاصر رہے کہ یہ منتشر احکام وفرامین اور متفرق خطبات وتعلیمات کا مجموعہ نہیں بلکہ ایک منظم ومرتب کتاب ہے۔ اس کا نظم وربط اسے انسانی کمال ووصف سے ممتاز کرتا ہے۔ اس کی ہر آیت دوسری آیت سے اور اسی طرح ہر سورت دوسری سورت سے گہرا ربط وتعلق رکھتی ہے۔ یہ نظم وضبط قرآن کے اول سے آخر تک موجود ہے۔ نظم کو معرفتِ علوم القرآن میں ایک اہم فن کی حیثیّت حاصل ہے۔ نظم کا لُغوی معنی ہے پرونا۔ ہر وہ چیز جسے کسی دوسری چیز کے ساتھ جوڑ دیا جائے یا کسی شے کے کچھ حصے کو کسی دوسری شے کے کسی حصے سے ملا دیا جائے تو یہ نظم کی صورت ہو گی۔ اسی لغوی پسِ منظر میں دھاگے کو بھی نظام کہا جاتا ہے کیونکہ یہ اشیاء کو جوڑتا ہے۔ معمول کی بات ہے کہ جب کسی معاملے میں کوئی خاص طریقہ واُصول روانہ رکھا جائے تو کہا جاتا ہے کہ یہاں کوئی نظام ہی نہیں۔[51] اصطلاحی طور پر نظم قرآن سے مراد اس الہامی کلام کا مربوط ومنظم اور ایک وحدت میں جڑا ہونا ہے۔ برصغیر میں نظمِ قرآن کے تصور کو فروغ دینے والے ممتاز مفسر مولانا حمید الدین فراہی نظم کی اصطلاح کو ان الفاظ میں واضح کرتے ہیں:

"نظم سے ہماری مراد یہ ہے کہ پوری سورت ایک مکمل وحدت کی صورت میں ظاہر ہو اور وہ سورت اپنے ماقبل اورمابعد کی سورتوں سے مناسبت رکھتی ہو۔ جس طرح ہم آیات کے باہم نظم میں پیش کر چکے ہیں، جس طرح بعض آیات بطور جملہ معترضہ کے آجاتی ہیں، اسی طرح بعض سورتیں بھی اسی نوعیت کی حامل ہوتی ہیں۔ اس نقطہ نظر سے دیکھا جائے

---

[51] الافریقی، ابن منظور، لسان العرب، **مادة نظم**، (بیروت: دارالفکر، س۔ن)، ۵: ٦٧؛ فیروزآبادی، مجد الدین ابو طاہر محمد بن یعقوب (م ۸۱۷ھ)، **القاموس المحیط**، (داراحیاء التراث العربی، ۱۹۹۷ء)، ۴: ۱۸۹

تو پورا قرآن ایک وحدت نظر آئے گا۔ جس کے جملہ اجزا میں شروع سے آخر تک ایک خاص طرح کی مناسبت اور ترتیب پائی جاتی ہے۔"[52]

نظمِ قرآن پر اپنے موقف کی وضاحت کرتے ہوئے وہ مزید لکھتے ہیں:

"یہ بات سمجھ لینی چاہیے، کہ نظام سے ہماری مراد یہ ہے کہ ہر سورت کی ایک مخصوص ہیئت ہوتی ہے کیوں کہ جب کلام کے معانی باہم دگر مربوط ہوں گے کسی عمود کے گرد گردش کریں گے اور کلام میں یکجہتی ہو گی تو لازمی طور پر اس کی ایک مخصوص ہیئت ابھر کر سامنے آئے گی۔ اس لیے جب کلام پر اس حیثیت سے غور کروگے تو اس کا جمال، پختگی اور برجستگی ابھر کر سامنے آجائے گی۔"[53]

نظمِ قرآن سے مراد قرآنِ حکیم کی آیات اور سورتوں کا مثالی ربط وتناسب ہے، اس سے پورے کلام کے اجزائے ترکیبی مکمل طور پر ہم آہنگ نظر آتے ہیں۔ یہ نظم ہماری توجہ اس جانب مبذول کراتا ہے کہ یہ ایک ایسی ذاتِ بابرکات کا منفرد و یکتا کلام ہے جس کی ترتیب میں خدائی علم وحکمت کا دخل ہے۔ نظمِ قرآن کے نام پر فروغ پانے والے علم کی اہمیت کا اندازہ اس امر سے لگایا جاسکتا ہے کہ بعض علماء ومفسرین نے اس ضمن پر باقاعدہ کُتب تحریر کی ہیں۔ اس پسِ منظر میں چند اہم کُتب اور اُن کے مؤلفین کا ذکر بہت مناسب ہے۔عثمان بن عمر وجاحظ (م۲۵۵ھ)، ابوداؤدالسجستانی(م۲۷۵ھ)، ابنِ الاخشید(م۳۲۶ھ)، ابوالحسن بن علی بن نصر، عبدالعلی بارزگان ان تمام مصنفین نے "نظم القرآن" کے نام سے کُتب تحریر کیں۔ اِن کے علاوہ برہان الدین بن عمر البقاعی(م۸۸۵ھ) نے "نظم الدرر فی تناسب الآی والسور" لکھی، منوربن عبدالحمید لاہوری(م۲۰۱۱ھ) نے "درر التنظیم فی ترتیب الآی والسور الحکیم" نے لکھی ،مولوی محمد غوث الملک بہادر(م۱۲۳۸ھ) نے "نثر المرجان فی رسم نظم القرآن" نے لکھی ،حمید الدین فراہی (م۱۳۴۹ھ) نے "تفسیر نظم القرآن ودلائل النظام" نے لکھی، مولانا اشرف علی تھانوی(م۱۹۴۳ء) نے "سبق الغایات فی نسق الآیات" لکھی، مولانا حسین علی نے "بلغۃ الحیران فی ربط آیات الفرقان" لکھی، ڈاکٹر درویش الجندی نے "النظم القرآنی فی کشاف الزمخشری" لکھی اور ڈاکٹر ثناء اللہ نے "علم تفسیر میں نظم وربط قرآن کریم کی اہمیت اور تاریخی پس منظر" لکھی۔[54]

---

[52] فراہی، حمید الدین، مولانا(م۱۳۴۹ھ)، **رسائل الامام الفراہی فی علوم القرآن**،(انڈیا: اعظم گڑھ، سرائے میر دائرہ حمیدیہ، ۱۹۹۷ء)، ۸۷

[53] م،ن

[54] ثناءاللہ، ڈاکٹر، **علم تفسیر میں نظم وربط قرآن کریم کی اہمیت اور تاریخی پس منظر**،(پشاور: اشاعت اکیڈمی، ۲۰۱۰ء)

علمِ تفسیر میں نظم کی اہمیت کے پیشِ نظر بہت سے مفسرین نے نظم وربط پر اپنی کتاب کے مقدمہ یامباحث کے اندر تفصیلی گفتگو کی ہے۔ قرآن فہمی میں سیاق وسباق کو زیرِ نظر رکھنا بہت ضروری ہے۔ کلام کے درمیان سے کوئی آیت منتخب کی جائے اور اس کا مفہوم اخذ کرنے کی کوشش کی جائے تو اس میں بڑی دقّت ہو گی۔ کلام کے مختلف حصوں کا تعلق اجمالی طور پر معلوم ہونا نہایت ضروری ہے، اس کے بغیر متکلم کے مقصد ومدعا کی حقیقت کو پانا ممکن نہیں۔ ڈاکٹر ابراہیم دیشمکھ کو اعتراضات کے اظہار سے قبل نظم قرآن کے ان تصورات کی تفہیم کرنا چاہیے تھی۔

قرآن مجید کے داخلی تصورِ ناسخ ومنسوخ پر اعتراضات:

ڈاکٹر ابراہیم دیشمکھ نے مسلمانوں کے قرآنی تصورِ تنسیخ کو پیچیدہ قرار دیا، اُس کا خیال ہے کہ کئی مسلمانوں نے اس تصور کی مزید تشریح کو ضروری سمجھا ہے۔ مسلمانوں کا یہ احساس کہ یہ تصور مزید واضح ہونا چاہیے اس مسئلہ کی موجودگی کا ثبوت ہے۔ قرآن نے مسلمانوں کے موقف کے مطابق بائبل کو کیوں منسوخ کرنا تھا جبکہ قرآن خود ہی ناسخ ہونے کے ساتھ منسوخ بھی ہے۔ یہ ایک تاریخی حقیقت ہے کہ مسلمان قرآن کی منسوخ آیات کی تعداد پر اتفاق نہیں کر سکے۔[55] مصنف کا موقف ہے کہ کسی خاص اشارہ یا وضاحت کی عدم موجودگی کی وجہ سے قرآن پاک کی ناسخ اور منسوخ آیات کا درست اندازہ کرنا نہایت مشکل ہے۔ علاوہ ازیں مصنف نے لکھا ہے کہ قرآن کے تصورِ جہاد اور تصورِ رواداری میں شدید تصادم ہے، ایک ہی وقت میں جہاد اور رواداری کے اُصولوں پر عمل نہیں ہو سکتا۔ یقیناً ایک تصور ناسخ ہے اور دوسرا منسوخ۔ علماء چونکہ ناسخ یا منسوخ آیات کے تعین میں اختلاف رکھتے ہیں، اس لئے یقین سے کہنا مشکل ہے کہ جہاد یا رواداری میں سے کسی تصور کو منسوخ سمجھا جائے اور کس کو ناسخ۔[56]

مسیحی پادریوں نے قرآن مجید کو غیر معتبر قرار دینے کے لیے بہت سے خُود ساختہ جواز تلاش کرنے کی کوشش کی۔ قرآن کے تصورِ نسخ پر ہونے والے اعتراضات بھی اسی کوشش کا ایک تسلسل ہیں۔ اسلام کو چھوڑ کر جانے والوں نے بھی اسی تصور پر اشکالات کا ذکر کیا ہے۔ مثلاً ڈاکٹر ابراہیم خان عمر خان دیشمکھ بھی اس قرآنی تصور کی حقیقت کو درست پسِ منظر میں سمجھنے سے قاصر رہے۔ اُس نے اِس تصور کو پیچیدگی اور اُلجھاؤ کا باعث قرار دیا۔ وہ اصرار کرتا ہے کہ قرآن اپنے اس تصور کی وضاحت اور مزید تشریح میں ناکام رہا ہے۔ وہ مسلمانوں کو طعنہ دیتا ہے کہ قرآن کس طرح بائبل کا ناسخ

---

[55] دیشمکھ، ابراہیم خان عمر خان، ڈاکٹر، **جستجوئے حق**، ۲۵، ۲۴

[56] م، ن، ۲۷

ہوسکتاہے جبکہ خُود قرآن کے بہت سے حصے منسوخ ہیں۔ اس امر پر بھی وہ اعتراض کرتا ہے کہ مسلم علماء قرآن مجید میں موجود منسوخ آیات کی تعداد پر متفق نظر نہیں آتے۔ اُس نے لکھا ہے کہ قرآن نے کسی خاص آیت کے منسوخ ہونے کا کوئی واضح اشارہ نہیں دیا۔ اس کمی نے فہمِ قرآن کو مشکل سے دوچار کر دیا ہے۔ اسی وجہ سے قرآن کی ناسخ یا منسوخ آیات کا صحیح اندازہ نہیں کیا جاسکتا۔[57] پادری موصوف کو چاہیے تھا کہ قرآنِ مجید پر اعتراض کرنے سے قبل وہ سابقہ شریعتوں کی روایت کا مطالعہ کر لیتے۔ خصوصاً جس دین کو انہوں نے نیا نیا قبول کیا تھا یعنی مسیحیت کے دینی مصادر پر نظر کر لیتے تو اُن کو اس اعتراض کی ضرورت محسوس نہ ہوتی۔ یہ ایک تاریخی اور ناقابلِ انکار حقیقت ہے کہ آیات و احکامات کا نسخ مسلمانوں سے شروع نہیں ہوا بلکہ یہ سابقہ شریعتوں کی خصوصیات میں بھی رہا ہے۔ حضرت آدمؑ کے عہد میں بھائی کے لیے جائز تھا کہ وہ اپنی بہن سے نکاح کر لے۔ حضرت سارہ بیوی تھیں حضرت ابراہیمؑ کی۔ وہ حضرت ابراہیمؑ کی باپ شریک یعنی (علاتی) بہن بھی تھیں۔ ابراہیمؑ کی شریعت میں علاتی بہن سے نکاح کر لینا جائز تھا۔ حضرت سارہؑ کے متعلق حضرت ابراہیمؑ کا بیان بائبل میں ملاحظہ ہو:

"وہ میری بہن ہے، وہ صرف میرے باپ کی بیٹی ہے اور میری ماں کی بیٹی نہیں ہے، وہ میری بیوی بن چکی ہے۔"[58]

اس کے برعکس حضرت موسیٰؑ کی شریعت میں بہن سے نکاح حرام تھا۔ یہ بہن خواہ کسی بھی رشتے میں ہو، ماں کی طرف سے ہو (اخیافی)، باپ کی جانب سے ہو (علاتی)، یا یہ کہ وہ ماں اور باپ دونوں کی طرف سے ہو (حقیقی)۔[59] مذکورہ انبیاءؑ کی شریعتوں پر غور کیا جائے تو واضح ہوتا ہے کہ وہاں بھی نسخ کی کارفرمائی ہے۔ بالکل واضح ہے کہ حضرت آدمؑ اور حضرت ابراہیمؑ کی شریعتوں میں بہن کے ساتھ نکاح کو جائز قرار دیا گیا تھا جبکہ حضرت موسیٰؑ کی شریعت میں اس کو نسخ کے اُصول اور حکم کے تحت ختم کر دیا گیا۔ ان مثالوں سے واضح ہے کہ شریعتوں میں موجود احکامات میں تبدیلی و تغیّر ہوتا رہا اور سابقہ احکامات منسوخ قرار پاتے رہے۔ نسخ کا یہ سلسلہ اور بہت سے معاملات میں نظر آتا ہے۔ حضرت نوحؑ کی شریعت میں ہر چلتا پھرتا جانور حلال قرار دیا گیا تھا۔[60] مگر حضرت موسیٰؑ کی لائی ہوئی شریعت میں بہت سے جانور حرام ٹھہرے۔ علاوہ ازیں حضرت یعقوبؑ کی شریعت کا اُصول یہ تھا کہ ایک ہی وقت میں دو بہنوں سے نکاح کر لینا جائز تھا اور بائبل ہی کا بیان ہے

---

[57] م،ن، ۲۴-۲۵

[58] بائبل، **کتاب پیدائش**، باب:۲۰، آیت:۱۲

[59] عہد نامہ قدیم، **کتاب الاحبار**، باب:۲۰، آیت:۱۷

[60] بائبل، **کتاب پیدائش**، باب:۹، آیت:۳

کہ حضرت یعقوبؑ نے خُود بھی اپنے ماموں کی دو بیٹیوں "لیاہ" اور "راخیل" کے ساتھ ایک ہی وقت میں نکاح کیا تھا۔ [61] حضرت موسیٰؑ کی شریعت میں یہ ضابطہ بدل دیا گیا اور بیک وقت دو بہنوں کو نکاح میں رکھنا ناجائز قرار پایا۔ بائبل کے الفاظ ملاحظہ ہوں: "تُو اپنی سالی سے بیاہ کر کے اُسے اپنی بیوی کی سوکن نہ بنانا کہ دوسری کے جیتے جی اِس کے بدن کو بھی بے پردہ کرے"۔ [62]

شریعتِ موسیٰؑ کے تسلسل میں شریعتِ محمدیہ ﷺ میں بھی دو بہنوں کا ایک شخص کے نکاح میں بیک وقت رہنا حرام قرار پایا۔ قرآنِ مجید میں واضح کیا گیا:

حُرِّمَتْ عَلَيْكُمْ أُمَّهَاتُكُمْ وَبَنَاتُكُمْ وَأَخَوَاتُكُمْ وَعَمَّاتُكُمْ وَخَالَاتُكُمْ وَبَنَاتُ الْأَخِ وَبَنَاتُ الْأُخْتِ وَأُمَّهَاتُكُمُ اللَّاتِي أَرْضَعْنَكُمْ وَأَخَوَاتُكُمْ مِنَ الرَّضَاعَةِ وَأُمَّهَاتُ نِسَائِكُمْ وَرَبَائِبُكُمُ اللَّاتِي فِي حُجُورِكُمْ مِنْ نِسَائِكُمُ اللَّاتِي دَخَلْتُمْ بِهِنَّ فَإِنْ لَمْ تَكُونُوا دَخَلْتُمْ بِهِنَّ فَلَا جُنَاحَ عَلَيْكُمْ وَحَلَائِلُ أَبْنَائِكُمُ الَّذِينَ مِنْ أَصْلَابِكُمْ وَأَنْ تَجْمَعُوا بَيْنَ الْأُخْتَيْنِ إِلَّا مَا قَدْ سَلَفَ إِنَّ اللَّهَ كَانَ غَفُورًا رَحِيمًا[63]

"تم پر تمہاری مائیں اور تمہاری بیٹیاں اور تمہاری بہنیں اور تمہاری پھوپھیاں اور تمہاری خالائیں اور بھتیجیاں اور بھانجیاں اور تمہاری (وہ) مائیں جنہوں نے تمہیں دودھ پلایا ہو اور تمہاری رضاعت میں شریک بہنیں اور تمہاری بیویوں کی مائیں (سب) حرام کر دی گئی ہیں، اور (اسی طرح) تمہاری گود میں پرورش پانے والی وہ لڑکیاں جو تمہاری ان عورتوں (کے بطن) سے ہیں جن سے تم صحبت کر چکے ہو (بھی حرام ہیں)، پھر اگر تم نے ان سے صحبت نہ کی ہو تو تم پر (ان کی لڑکیوں سے نکاح کرنے میں) کوئی حرج نہیں، اور تمہارے ان بیٹوں کی بیویاں (بھی تم پر حرام ہیں) جو تمہاری پشت سے ہیں، اور یہ (بھی حرام ہے) کہ تم دو بہنوں کو ایک ساتھ (نکاح میں) جمع کرو سوائے اس کے کہ جو دورِ جہالت میں گزر چکا۔ بیشک اللہ بڑا بخشنے والا مہربان ہے۔"

شرائع سابقہ میں طلاق کے معاملہ میں بھی نسخ کا قاعدہ استعمال کیا گیا۔ حضرت موسیٰؑ کی شریعت میں طلاق کی اجازت عام تھی [64] جبکہ حضرت مسیحؑ کی شریعت کا اُصول یہ قرار پایا کہ عورت کو زنا کے ارتکاب کے علاوہ کسی بھی صورت

---

[61] بائبل، **کتاب پیدائش**، باب:۲۹، آیات:۱۶-۲۸

[62] بائبل، **کتاب احبار**، باب:۱۸، آیت:۱۸

[63] النساء:۲۳

[64] **بائبل کتاب استثناء**، باب:۲۴، آیات:۱-۲

میں طلاق نہیں دی جاسکتی۔[65] اسی طرح حضرت موسیٰؑ کی شریعت میں یومِ سبت کے بارے میں دائمی حکم تھا کہ اس کی تعظیم کی جائے۔ ہلکا پھلکا کام بھی اس روز کرنا منع تھا۔[66] اس کے برعکس حضرت عیسیٰؑ کی شریعت میں یومِ سبت کا ایسا کوئی امتیاز نظر نہیں آتا۔ دیگر شریعتوں کے احکام کی تنسیخ کے علاوہ ایک ہی شریعت میں نسخ کی مثالیں بھی موجود ہیں۔ حضرت عیسیٰؑ کے بعد اُن کے ماننے والوں نے بہت سے احکام کو نسخ کے قاعدہ کے تحت ختم کر دیا۔ اس ضمن میں ختنہ کی مثال بڑی اہم ہے۔[67] پولوس کا یہ بیان بڑا بامعنی ہے:

"غرض پہلا حکم کمزور اور بے فائدہ ہونے کے سبب سے منسوخ ہو گیا۔"[68]

اسی بیان کی تمہید کے طور پر اُس کا یہ بیان بھی شاملِ بائبل ہے:

"اور جب کہانت بدل گئی تو شریعت کا بھی بدلنا ضُرور ہے۔"[69]

نسخ کا اُصول اور شریعتوں میں اس کی حیثیت ایک امرِ مسلمہ ہے۔ سابقہ شریعتوں کے احکام منسوخ ہوتے رہے، خُود ایک ہی شریعت میں نسخ کا اُصول کار فرما رہا۔ اس شرعی اور تاریخی پس منظر میں مسیح پادریوں کو قرآن مجید کے نسخ کے تصور پر اعتراض نہیں کرنا چاہیے تھا۔ اس حقیقت اور اُصول کو تسلیم کرنے کے برعکس مسلمانوں کے خلاف کُتب تحریر کر کے اس تصور پر اعتراضات کیے گئے۔

جہاد اور توسیعِ اسلام کے طریقہ کار پر ابہامات:

ڈاکٹر ابراہیم دیشمکھ کا نتیجۂ فکر یہ ہے کہ مسلمانوں کا تصورِ جہاد مبہم ہے اور توسیعِ اسلام کا طریقہ کار اشکالات کا شکار ہے۔ ایک طرف قرآن مذہبی رواداری کا درس دیتا ہے تو دوسری طرف یہ کہا جاتا ہے کہ اسلام کے علاوہ کوئی دین اللہ تعالیٰ کو قبول نہیں اور جو لوگ اسلام کو ترک کریں گے وہ ہمیشہ کے لئے عذاب دیئے جائیں گے۔ علاوہ ازیں مسلمان جہاد کے ذریعے غیر مسلموں کو مسلمان بنانا چاہتے ہیں۔ جہاد کا مقصد اسلامی تسلط قائم کرنا ہے۔ وہ حیرت کا اظہار کرتا ہے کہ

---

[65] بائبل، **کتاب متی**، باب:۱۹، آیات:۷-۹

[66] بائبل، **کتاب خروج**، باب:۳۵، آیت:۲

[67] بائبل، **گلیتوں کے نام کا خط**، باب:۵، آیت:۶

[68] بائبل، **عبرانیوں**، باب:۷، آیت:۱۸

[69] بائبل، **عبرانیوں**، باب:۷، آیت:۱۲

ایک طرف کہاجاتاہے کہ اسلام میں جبر واکراہ کا دخل نہیں بلکہ دوسری طرف مخالفین کو ختم کرنے کی منصوبہ بندی کی ترغیب دی جاتی ہے۔[70] وہ تصورِ جہاد کو مذہبی رواداری کے خلاف قرار دیتا ہے۔

فکر اسلامی میں جہاد ایک مبنی بر خیر تصور ہے، اس ہمہ جہت علمی و عملی سرگرمی کے نتیجے میں فروغِ اسلام کی مشکل ترین منزلیں بڑی آسانی سے سَر کرلی گئیں، اسلام کا نظریہ ٔجہاد لالچ و طمع، خود غرضی اور کم ظرفی کی آلائشوں سے پاک ہے۔ جہاد کا مقصد مال اکٹھا کرنا ہے اور نہ کشور کشائی۔ جس طرح مال غنیمت اور ملک وولایت کے حُصول کا اسلامی جہاد سے کوئی تعلق نہیں ہے، اسی طرح اسلامی جہاد کا دہشت گردی سے بھی کوئی تعلق وواسطہ نہیں ہے۔ جہاد عربی زبان کا لفظ ہے جس کے لغوی معنی محنت ومشقت، کوشش اور جہد وجہد کے ہیں۔ امام ابن فارس علیہ الرحمہ لکھتے ہیں:

"جَهْدٌ الْجِيْمُ وَالْهَاءُ وَالدَّالُ أَصْلُهُ الْمَشَقَّةُ، ثُمَّ يُحْمَلُ عَلَيْهِ مَا يُقَارِبُهُ"[71]

"لفظ جہد (جیم، ہاء اور دال) کے اصل معنی تو مشقت کے ہیں، پھر اس کو قریب المعنی الفاظ پر بھی محمول کیا جانے لگا۔"

اصطلاح میں اپنی تمام صلاحیتوں کو اللہ تعالیٰ کی رضا کی خاطر نیکی کے کاموں کے لیے وقف کر دینے کو جہاد کہا جاتا ہے۔ میر سید شریف علی جرجانی علیہ الرحمہ لکھتے ہیں: "هُوَ الدُّعَاءُ إِلَى الدِّيْنِ الْحَقِّ"[72] "جہاد دین حق کی طرف دعوت دینے کا نام ہے۔"

دورحاضر میں جہاں غیر مسلم مفکرین نے اسلامی جہاد کے تصور کو بُری طرح مجروح کیا، وہاں دہشت گردوں نے دہشت گردی پر جہاد کا لیبل لگا کر اسلامی جہاد کو بُری طرح بدنام کیا ہے۔ غیر مسلم مفکرین کی طرف سے اسلامی جہاد پر ایک اعتراض یہ کیا جاتا ہے کہ یہ انسانی جان کے لیے بہت بڑا خطرہ ہے۔ اس کی وجہ سے بہت سارے لوگ اپنی زندگی سے ہاتھ دھو بیٹھتے ہیں۔ یہ اعتراض ایک غلط فہمی کی بناء پر کیا جاتا ہے۔ وہ غلط فہمی یہ ہے کہ جہاد کو "جنگ" کے معنی میں لیا جاتا ہے اور اس کو عربی لفظ "الحرب" کے مترادف مانا جاتا ہے۔ حالانکہ جہاد کا معنی نہ تو جنگ ہے اور نہ ہی یہ "الحرب" کے مترادف ہے جو تباہی وبربادی کے معنی میں آتا ہے۔ قرآن کریم میں لفظ جُہد اور جہاد کے ۱۵ مشتقات کو ۳۶ آیات میں ۴۱ مرتبہ ذکر کیا گیا ہے اور ان میں سے ۳۱ آیات میں بالواسطہ یا بلاواسطہ لڑنے یا جنگ کرنے کا معنی نہیں پایا جاتا، صرف ۴ آیات کے سیاق وسباق میں جنگ کا معنی پایا جاتا ہے۔ قرآن کریم میں جہاد اور قتال کو

---

[70] غلام رسول سعیدی، **تبیان القرآن**، (لاہور: رومی پبلی کیشنز اینڈ پرنٹرز، ۲۰۰۹ء)، ۶: ۲۵-۲۷

[71] احمد بن فارس، ابوالحسین، **القزوینی**، (م ۳۹۵ھ)، **معجم مقاییس اللغۃ**، (بیروت: دارالکتب العلمیہ، ۲۰۱۰ء)، ۲۱۰

[72] جرجانی، علی بن محمد بن علی، امام (م ۸۱۶ھ)، **کتاب التعریفات**، (لاہور: مکتبہ رحمانیہ، ۲۰۰۹ء)، ۱۱۲

کسی جگہ بھی اکٹھاذ کر نہیں کیا گیا بلکہ اِن دونوں کو علیحدہ علیحدہ بیان کیا گیا ہے، تا کہ لوگ اِن دونوں کو ہم معنی یا مترادف نہ سمجھ لیں۔ قابلِ غور بات یہ ہے کہ جس مذہب ودین کے نام میں ہی امن وعافیت کا مفہوم پایا جاتا ہو، وہ کیونکر بے جا خون خرابہ اور تباہی وبربادی کی طرف دعوت دے سکتا ہے۔ اسلام میں ایک مُسلم کے قتل اور ایذارسانی کی حُرمت کے ساتھ ساتھ غیر مسلم شہریوں کے قتل اور ان کی ایذارسانی بھی گناہ ہے۔ قرآن کریم اور احادیث طیبہ میں اس کی بہت ساری امثلہ موجود ہیں۔ اللہ تعالیٰ کا فرمان ہے:

مَن قَتَلَ نَفْسًا بِغَيْرِ نَفْسٍ أَوْ فَسَادٍ فِي الْأَرْضِ فَكَأَنَّمَا قَتَلَ النَّاسَ جَمِيعًا وَمَنْ أَحْيَاهَا فَكَأَنَّمَا أَحْيَا النَّاسَ جَمِيعًا[73]

"جس نے کسی جان کو خون کے بدلے کے بغیر یا زمین میں فساد بپا کرنے کے گناہ کے بغیر قتل کر دیا تو گویا اس نے تمام انسانوں کو قتل کر دیا، جس نے کسی کو زندگی بخشی اس نے گویا تمام انسانوں کو زندگی بخشی۔"

فکرِ اسلامی میں قتل کرنے کو پوری انسانیت کے قتل کے مترادف شمار کیا گیا ہے۔ کسی کی زندگی بچانے کو پوری انسانیت کی زندگی بچانے کے مترادف قرار دیا گیا ہے۔ اس میں "نفس" کو نکرہ لا کر اس بات کی طرف اشارہ کیا گیا ہے کہ مقتول آدمی مسلم ہو یا غیر مسلم، اس کا تعلق کسی بھی مذہب سے ہو، وہ کوئی بھی زبان بولتا ہو، وہ کسی بھی رنگ کا ہو، تمام صورتوں میں اس کا حکم ایک ہی ہے کہ اس کو قتل کرنا حرام ہے، اس کو قتل کرنے کا اتنا ہی گناہ ہے جتنا پوری انسانیت کو قتل کرنے کا گناہ ہے۔ اسی طرح احادیث طیبہ میں بھی غیر مسلم کو ناحق قتل کرنے کی سختی سے ممانعت وارد ہوئی ہے۔ حضرت عبد اللہ بن عمر رضی اللہ عنہما سے روایت ہے کہ نبی اکرم ﷺ نے ارشاد فرمایا:

"مَنْ قَتَلَ مُعَاهَدًا لَمْ يَرِحْ رَائِحَةَ الْجَنَّةِ، وَإِنَّ رِيحَهَا تُوجَدُ مِنْ مَسِيرَةِ أَرْبَعِينَ عَامًا"[74]

"جس نے کسی معاہد کو قتل کر دیا تو جنت کی خوشبو نہیں سونگھ سکے گا، حالانکہ جنت کی خوشبو چالیس سال کی مسافت سے محسوس کی جائے گی۔"

معاہد اس غیر مسلم کو کہا جاتا ہے جو اجازت لے کر دوسرے ملک سے کسی اسلامی ملک میں آیا ہو۔ حدیثِ مبارک میں قاتل کی اُخروی سزا بیان کی گئی ہے کہ وہ جنت کی خُوشبو بھی نہیں سونگھ سکے گا۔ تعلیمات اسلامیہ میں کسی کے

---

[73] المائدة:۳۲

[74] البخاری، محمد بن اسماعیل، امام (م ۲۵۶ھ)، الجامع الصحیح، **کتاب الجزیة**، باب اثم من قتل معاہدا بغیر جرم، (لاہور: مکتبہ رحمانیہ، ۲۰۱۷ء)، حدیث:۲۹۹۵

ساتھ ظلم کرنے سے منع کیا گیا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ نبی اکرم ﷺ نے حالت جنگ میں غیر مسلم خواتین، بچے اور بوڑھوں کو قتل کرنے سے منع فرمایا۔ حضرت ابن عمر رضی اللہ عنہما سے مروی ہے، وہ فرماتے ہیں:

"وُجِدَت امْرَأَةٌ مَقْتُوْلَةً فِي بَعْضِ مَغَازِي رَسُوْلِ اللهِ صلى الله عليه وآله وسلم، فَنَهَى رَسُوْلُ اللهِ صلى الله عليه وآله وسلم عَنْ قَتْلِ النِّسَاءِ وَالصِّبْيَانِ"[75]

"نبی اکرم ﷺ کے ایک غزوہ میں ایک مقتولہ عورت پائی گئی تو نبی اکرم ﷺ نے عورتوں اور بچوں کو قتل کرنے سے منع فرمایا۔"

حضرت انس بن مالک رضی اللہ عنہ سے روایت ہے، وہ فرماتے ہیں کہ نبی اکرم ﷺ نے ارشاد فرمایا:

"وَلَا تَقْتُلُوا شَيْخًا فَانِيًا وَلَا طِفْلًا وَلَا صَغِيرًا وَلَا امْرَأَةً"[76]

"نہ بوڑھے کو قتل کرو، نہ بچے کو اور نہ عورت کو قتل کرو۔"

حالتِ جنگ میں جس طرح غیر مسلم خواتین، بچوں اور بوڑھوں کو قتل کرنے سے منع کیا گیا، اسی طرح غیر مسلم مذہبی رہنما، تاجر، کاشتکار اور غیر محارب غیر مسلم کو بھی تحفظ دیا گیا۔ غیر مسلموں کے خلاف شب خون مارنے، غیر مسلموں کو آگ میں جلانے، غیر مسلم دشمنوں کے گھروں میں گھسنے اور اور لوٹ مار کرنے، غیر مسلم دشمنوں کے مویشیوں، فصلوں اور املاک کو نقصان پہنچانے سے منع کیا گیا۔ اس کے علاوہ اگر زمانہ رسالت میں غزوات اور سرایا کا اندازہ لگایا جائے تو پتا چلتا ہے کہ غزوات و سرایا کی کُل تعداد ۸۲ ہے۔ ان تمام غزوات و سرایا میں مقولین کی تعداد ۱۰۱۸ دس سو اٹھارہ ہے۔ ان کو ۸۲ پر تقسیم کیا جائے تو ۱۲.۴۱۴۶ جواب آتا ہے۔ یعنی ایک جنگ میں ۱۳ لوگوں سے بھی کم لوگ قتل ہوئے۔ اسلامی جنگوں کے علاوہ اگر باقی جنگوں کا اندازہ لگایا جائے تو چھوٹی چھوٹی جنگوں میں لاکھوں کے حساب سے لوگ مارے جاتے ہیں۔ اس سے پتا چلتا ہے کہ جہادِ اسلامی انسانی جان کے لیے خطرہ نہیں بلکہ انسانی جان کے لیے خطرہ تو غیر اسلامی جنگیں ہیں جن میں دشمنی کی وجہ سے فاتح قوم مفتوح قوم کے خواتین، بچوں، بوڑھوں اور بیماروں کا لحاظ کیے بغیر قتل عام کرتی ہے، مفتوح قوم کے اموال، فصلوں اور گھروں کو لوٹ لیا جاتا ہے۔ اسلام نے آکر ان تمام مفاسد اور خرابیوں کو ختم کرنے کا اعلان کیا ہے۔

---

[75] البخاری، الجامع الصحیح، **کتاب الجهاد والسیر**، باب قتل النساء فی الحرب، حدیث: ۲۸۵۲

[76] ابو داؤد، سلیمان بن اشعث، السجستانی (م ۲۷۵ھ)، السنن، **کتاب الجهاد**، باب دعاء المشرکین، (لاہور: مکتبہ رحمانیہ، ۲۰۱۶ء)، حدیث: ۲۶۱۴

احادیثِ نبوی صَلَّی اللّٰہُ عَلَیْہِ وَسَلَّم کی صحت اور تشریحی حیثیت پر اعتراضات:

ڈاکٹر ابراہیم دیشمکھ نے احادیثِ نبوی کی صحت اور حفاظت پر اعتراضات کئے، وہ لکھتا ہے کہ قرآن مجید کو اچھی طرح سمجھنے کے لئے احادیث کی ضرورت نہیں کیونکہ قرآن کا دعویٰ ہے کہ وہ ایک انوکھا اور اکمل پیغام ہے، اسے سمجھنے کے لئے کسی خارجی ذریعے اور سہارے کی ضرورت نہیں۔ حدیث کی حجیت پر شکوک وشبہات کا اظہار کرتے ہوئے اس نے بعض منکرینِ حدیث کی طرف اشارہ کیا ہے اور لکھا ہے کہ اس نے اس ضمن میں بہت کچھ سنا اور پڑھا ہے۔[77] قرآن مجید کے احکامات اور اس کی آیات کی تفہیم کے پس منظر میں یہ سمجھ لینا نہایت ضروری ہے کہ حدیثِ رسول صَلَّی اللّٰہُ عَلَیْہِ وَسَلَّم ایک ایسا قابلِ اعتماد اور بابرکت علمی وسیلہ ہے جس میں قرآنی اشارات کی تفصیل و تشریح موجود ہے، اصحابِ رسولؓ اگرچہ خود اہلِ عرب تھے اور کئی نسلوں سے عربی زبان کی لطافتوں اور باریکیوں سے پوری طرح واقف تھے، وہ بھی محض الفاظ و کلمات کی مدد سے اللہ تعالیٰ کی منشاء کو پوری طرح سمجھ لینے سے قاصر تھے، اُنہوں نے قرآنی تعبیرات و تشریحات کی رُوح کو پانے کے لئے ذاتِ رسول صَلَّی اللّٰہُ عَلَیْہِ وَسَلَّم سے رہنمائی حاصل کرنا ضروری خیال کیا۔[78] علاوہ ازیں قرآن مجید میں بہت سے فرامین ایسے ہیں جن کی وضاحت صرف حدیثِ نبویؐ سے ممکن ہے،[79] بعض جگہ قرآن مجید نے مختصر اشارہ کیا ہے، اُس کی تفصیل کے لئے بھی حدیث کی معلومات درکار ہوتی ہیں، اس پس منظر میں شریعتِ اسلامیہ میں حدیث کی تشریحی حیثیّت کا اقرار و بیان نہایت ضروری ہے،[80] فہمِ قرآن کا یہ وہ مخصوص پہلو ہے جسے تاریخِ اسلام کے کسی بھی مرحلہ میں مسلم علماء و مفکرین نے نظر انداز نہیں کیا۔ نو مسیحی پادری ڈاکٹر ابراہیم دیشمکھ کا موٴقف ہے کہ فہمِ قرآن کے لیے حدیث کی کوئی ضرورت نہیں۔ وہ حدیث کو ایک غیر متعلق علم قرار دیتا ہے۔[81] درج بالا دلائل و شواہد کی روشنی میں پادری موصوف کے خیالات حقیقتِ حال سے بہت دُور دکھائی دیتے ہیں۔ امر واقعہ یہ ہے کہ حدیث کے بغیر قرآن فہمی کی کوشش خطرناک نتائج کی حامل ہو سکتی ہے۔ یہی وجہ ہے کہ مفسرین احادیثِ نبویؐ سے بھرپور استفادہ کرتے ہیں۔

---

[77] م،ن، ۲۹،۳۰

[78] ڈاکٹر خالد محمود، **آثار الحدیث**، (لاہور: دارالمعارف، ۱۹۸۵ء)، ۱: ۱-۳۰۰

[79] محمد ادریس میرٹھی، **سنت کا تشریعی مقام**، (کراچی: بیت التوحید، آصف کالونی، ۲۰۱۵ء)، ۱-۶۰

[80] سید ابوالاعلیٰ مودودی، **سنت کی آئینی حیثیت**، (لاہور: اسلامک پبلیکیشنز، ۲۰۰۴ء)، ۱-۷۵

[81] ڈاکٹر ابراہیم دیشمکھ، **جستجوئے حق**، ۲۹-۳۰

خلاصہ بحث:

ڈاکٹر ابراہیم دیشکھ کے حالات وواقعات کے مطالعہ سے انسانی ذہن میں بہت سے سوالات جنم لیتے ہیں، اُس نے ترکِ اسلام کی کہانی کو تیس سال تک قلم بند کیوں نہ کیا، آپ بیتی کی ترتیب و تدوین اور اصلاح میں ارنسٹ ہان نے جس مستعدی کا مظاہرہ کیا ہے اُس کے پس منظر میں کیا سیاسی ومعاشی محرکات کار فرما ہیں، مصنف کا خاندان غیر مذہبی رجحانات کا حامل تھا، ایسے کمزور عقیدہ کے حامل مسلمان کی رائے علمی واعتقادی میدان میں کیا حیثیت رکھتی ہے، مذہب بیزار انسان کی تبدیلیٔ مذہب کی حرکت کو کس حد تک سنجیدہ لینا چاہیئے، میڈیکل کالج میں مسیحیوں سے روابط میں مضبوطی کے حقیقی اسباب کیا ہیں، مصنف نے کسی پختہ علم کے حامل مسلمان سے قرآنِ مجید کی تعلیم حاصل نہیں کی تھی لہذا قرآنِ مجید کا ذاتی سطح پر مطالعہ کتنا نتیجہ خیز ہو سکتا تھا، مناسب رہنمائی کے بغیر قرآنی حقائق کی معرفت حاصل ہو جانا کتنا مشکل معاملہ ہے، قصصِ قرآنی پر مصنف کے اعتراضات مسلمانوں کے دینی ادب سے عدمِ دلچسپی کا نتیجہ ہیں، بائبل و قرآن کے باہمی اختلافات سے اُس نے یہ نتیجہ اخذ کیا کہ قرآن کلامِ خدا نہیں حالانکہ مسلم فکر کے پسِ منظر میں اُس کو اس چیز کی تحقیق کرنا چاہیئے تھی کہ بائبل میں کتنی تحریفات ہو چکی ہیں، تحریف کے بارے میں مسلمانوں کے دعویٰ کو سمجھ لینے کے بعد یہ واضح ہو جاتا ہے کہ بائبل و قرآن کے قصص میں مطابقت ویکسانیت تلاش کرنا زیادہ افادیت کا حامل نہیں ہے۔ قرآن کے تصورِ ناسخ ومنسوخ، قرآن کی جمع وتدوین، جہاد، اشاعتِ اسلام کے ذرائع، موجودہ بائبل کی افادیت، حجیتِ حدیث اور اسلامی فکر وفلسفہ سے متعلق دیگر اُمور ومباحث کی تفہیم کے لئے اُس نے کسی معتبر مسلم مصدر سے استفادے کی کوشش نہیں کی۔ اگر اسلام کے بنیادی مصدر یعنی قرآن مجید کو اُس نے پڑھا بھی ہے تو بغیر کسی رہنمائی کے اُس نے یہ عمل کیا ہے۔ اس غیر علمی اور غیر سنجیدہ پسِ منظر میں ڈاکٹر ابراہیم دیشکھ کے اوہام اور اشکالات بڑی کمزور بنیاد کے حامل ہیں۔